MONTHLY AWAMI JAMHURIAT LAHORE

ماہنامہ عوامی جمہوریت لاہور

★★★★

اکتوبر 2011ء

وال سٹریٹ تحریک کے ساتھ اظہار یکجہتی کیلئے بائیں بازو کی طرف سے سامراج، سرمایہ داری اور جاگیرداری مخالف کیمپ و ریلی کے لاہور میں مناظر

وال سٹریٹ تحریک کے سلسلے میں کراچی میں مظاہرہ

وال سٹریٹ تحریک کے سلسلے میں لاہور میں خواتین کا جوش وخروش

ورکرز پارٹی پاکستان کا ترجمان

CPL.NO. 279

شمارہ نمبر 7

جلد نمبر 8

اکتوبر 2011ء

قیمت 30 روپے

MONTHLY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE

ماہنامہ

عوامی جمہوریت لاہور

اس شمارے میں

فہرست

اداریہ	''وال سٹریٹ پر قبضہ کرو'' تحریک		2
	﴿حمید اختر بھی چل بسے﴾		3
مضامین	مہاجر سیاست کے بنیادی محرکات	بابر ایاز	4
	ایم کیو ایم کا مستقبل	بابر ایاز	7
	ترقی پسند تحریک ۔۔ سفر در سفر	مسلم شمیم	9
	پاکستان کو جمہوری اور ترقی پسند ریاست بنایا جائے	عابد حسن منٹو	11
	لاعلمی دلیل نہیں ہوتی	سعید احمد	12
خبریں	روایتی مائنڈ سیٹ کی مظہر APC	آفتاب احمد شیخ	13
	سرمایہ داری، جاگیرداری سامراج مخالف کیمپ کا ناصر باغ میں ڈیرے ڈالنے کا اعلان		15
	لاہور میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام مخالف کیمپ وریلی		16
	ریگل چوک تا کراچی پریس کلب ''سرمایہ داری مخالف محاذ'' کی جانب سے سرمایہ داری کے خلاف احتجاجی ریلی		17
	ضلع فیصل آباد میں پارٹی سرگرمیاں	عرفان چوہدری	18
	نظم شناخت	سیدہ نزہت صدیقی	19
	نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (پنجاب) کا پہلا کنونشن		20

ایڈیٹر

نعیم شاکر

مجلس ادارت

عابد حسن منٹو

اختر حسین

مسلم شمیم

رابطہ آفس

5۔میکلوڈ روڈ، لاہور پاکستان

فون: 042-37353309-37357091

فیکس: 94-42-36361531

Email:nshakir12@gmail.com

اکاؤنٹ نمبر: 01357900053903

حبیب بینک لمیٹڈ مال برانچ لاہور

سرکولیشن انچارج

نصیر ہمایوں

پبلشر محمد اسلم ملک نے لاہور آرٹ پریس انارکلی لاہور سے چھپوا کر 5۔میکلوڈ روڈ، لاہور سے شائع کیا

''وال سٹریٹ پر قبضہ کرو'' تحریک

واشنگٹن امریکہ کا سیاسی دارالحکومت ہے، جبکہ نیویارک وہاں کا کاروباری، مالیاتی اور کارپوریٹ مرکز ہے۔ اسی نیویارک شہر کے ایک حصے کو مین ہیٹن (Manhattan) کہا جاتا ہے جہاں مالیاتی اداروں، سٹاک ایکسچینج اور عالمی سرمایہ دار کمپنیوں کے مراکز ہیں۔ اسی علاقے کی ایک اہم سڑک ''وال سٹریٹ'' ہے جسے عالمی طور پر سرمایہ داری نظام کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے۔۔۔۔۔ پچھلے کئی ہفتوں سے نیویارک میں ''وال سٹریٹ پر قبضہ کرو'' Occupy the Wall Street کے نام سے جو تحریک عام شہریوں، نوجوان خواتین وحضرات، بیروزگاروں، مزدوروں، طلباء اور اساتذہ، دانشوروں اور تخلیق کاروں نے شروع کر رکھی ہے وہ امریکہ کے کئی دوسرے شہروں اور پھر یورپ اور یورپ سے باہر دنیا بھر میں پھیل گئی ہے۔۔۔۔۔ پاکستان میں لاہور اور کراچی میں ورکرز پارٹی پاکستان اور لیبر پارٹی نے نوجوانوں اور محنت کشوں کے اشتراک سے اس تحریک سے یکجہتی کے اظہار اور پاکستانی عوام کے معاشی مسائل کو اجاگر کرنے کے حوالے سے 22 اور 23 اکتوبر کو مظاہروں کا انعقاد کیا ہے۔

ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کی معیشت عام طور پر اور امریکہ کی معاشیات خاص طور پر پچھلے چند سالوں سے مسلسل بحرانوں کا شکار ہے جس نے ہر ملک کی معیشت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ بیدریغ منافع خوری اور سٹہ بازی کے رجحانات نے دولت کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے اور ایک محدود طبقے کو امیر سے امیر تر بنانے کے عمل میں جو شدت پیدا کی اس نے معیشت کا وہ توازن بگاڑ دیا جو سرمایہ دارانہ نظام کو اس کے دائمی تضادات سے بچانے کے لئے وقتاً فوقتاً وضع کیا جاتا رہا ہے۔ دوسری طرف ٹیکنالوجی کی ترقی نے پیداواری عمل کو متاثر کیا، پیداوار میں اضافہ ہوتا گیا، تاہم محنت کرنے والے ہاتھوں کی جگہ جدید ٹیکنالوجی پر انحصار بڑھتا گیا۔ سستی محنت اور سستے داموں خام مال کو پیداواری عمل میں از سر نو اہمیت حاصل ہوئی اور کارخانے امریکہ سے نکل کر کم ترقی یافتہ ملکوں میں لگنے لگے چنانچہ بیکاری میں مسلسل اور مستقل اضافہ ہوا اور آج امریکہ قریب قریب مستقلاً نو فیصد سے زائد بیروزگاری کا شکار ہے۔۔۔۔ سوشلسٹ دنیا کے انتشار کے نتیجے میں وہ چیلنج جو متبادل معاشی نظام کے باعث سرمایہ دار دنیا کو ملا تھا اور جس نے welfare state، بیروزگاری الاؤنس، سبسڈی اور سوشل سیکورٹی کے طریقے ایجاد کئے تھے اس کی اہمیت کم ہوتی گئی اور منڈی کے نام پر کھلا استحصال تیز تر ہوتا گیا۔۔۔ گلوبلائزیشن کے نام پر سامراجی استحصال کو از سر نو مرتب کرنے کا نتیجہ بھی ایک طرف کارپوریٹ سرمایہ داری کے منافعوں اور لوٹ میں ہوش رُبا اضافہ اور دوسری طرف تیسری دنیا کی پسماندگی میں مزید اضافہ تھا۔ تاہم اس نئے عالمی نظام نے بھی ترقی یافتہ سرمایہ داری ممالک کے عوام کی بڑھتی ہوئی مشکلات اور مسائل کا کوئی حل نہ نکالا۔ بے اطمینانی، معاشی بے یقینی اور مستقبل میں مزید تر مشکلات کا خوف بڑھتا ہی گیا۔۔۔۔ پچھلے چند برسوں میں مختلف موقعوں پر اس بے چینی کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ تاہم اس مرتبہ نیویارک اور وال سٹریٹ میں دھرنا دینے والے ہزاروں مرد وزن براہ راست 'سسٹم' کے بارے میں سوال اٹھا رہے ہیں اور سرمایہ داری نظام کے عالمی سمبل 'وال سٹریٹ' کو ہدف بنا رہے ہیں۔۔۔۔ 1930ء کے معاشی بحران کے وقت بھی 'نظام' زیر بحث آیا تھا۔ اس وقت امریکہ میں بائیں بازو کی سیاسی پارٹیاں متحرک تھیں اور عالمی سطح پر ایک متبادل نظام قائم اور مستحکم ہو رہا تھا۔۔۔ پھر مشکلات کا حل سرمایہ داری نظام کے اندر ہی اصلاحات کے ذریعے کیا گیا اور ایک لمبے عرصے کے لئے امریکی عوام اور محنت کشوں کی یونینیں امریکی سرمایہ داری نظام کے از سر نو استحکام کے حصار میں آ گئے۔۔۔۔ چنانچہ موجودہ احتجاج اس اعتبار سے مختلف ہے کہ یہ 'نظام' کی افادیت کو فوکس کرتا ہے۔۔۔۔ امریکہ سے باہر یورپ، جاپان اور دوسرے ایشیائی ممالک میں جہاں جہاں یہ احتجاج پھیلا ہے وہاں اُس کی شکل اور شدت ان مخصوص حالات کے مطابق ہے جن سے ان ممالک کے عوام دوچار ہیں اور ان میں خاص بات ان ممالک میں متبادل نظام کے لئے اور معیشت کو سرمایہ دارانہ رشتوں سے آزاد کروانے والی سیاسی جماعتوں اور نوجوانوں اور محنت کشوں کی تنظیموں کی موجودگی ہے۔ جس قدر یہ طاقتور اور منظم ہیں اسی قدر احتجاج میں کیفیاتی (qualitative) اور کمیاتی (quantitative) فرق نظر آئے گا۔

یہ احتجاج، دھرنے اور عالمی سرمایہ داری کے خلاف نفرت کا اظہار صرف شروعات ہیں، ابھی انقلاب کی منزل دور ہے۔۔۔۔ عالمی انقلاب، سرمایہ دارانہ نظام کے موجودہ عالمی کردار، گلوبلائزیشن اور نوسامراجیت کو بدلنے کا نام ہے۔ یہ ہر ملک (بشمول ترقی یافتہ ممالک) کے اندرونی تضادات کی بنیاد پر انقلابی جدوجہد اور عالمی سطح پر ایک مربوط انقلابی تحریک ہی کے نتیجے میں ممکن ہے۔ چنانچہ ہر طرح کی انقلابی جدوجہد اور سماجی تبدیلی کی ہر تحریک کا انحصار منظم اور سائنٹیفک علم اور شعور سے لیس سیاسی جماعت پر ہوتا ہے۔۔۔۔ نوے کی دہائی سے کچھ پہلے سے ہی بائیں بازو کی عالمی تحریک نظریاتی اور تنظیمی بحرانوں کا شکار رہی ہے، آج کے عالمی تناظر میں اس کو منظم کرنا ایک بڑا کام ہے۔

پچھلے دنوں عرب دنیا میں شخصی اور طبقاتی آمریتوں کے خلاف جو جدوجہد جاری ہوئی وہ بھی ہر ملک کے عوام کے تجربات اور مسائل کی بھرمار کا نتیجہ تھا۔ تاہم طاقتور طبقاتی تنظیموں اور سماجی تبدیلی کے شعور سے لیس سیاسی جماعتوں کی کمزوری کے باعث مذہبی اور نیم مذہبی بنیادوں پر قائم سیاسی جماعتوں، طاقتور فوجی اور دوسری انتظامیہ اور امریکہ اور اس کے حواریوں کو ان تحریکات کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کا موقع ملا ہے۔

بہرحال دنیا اب کارپوریٹ گلوبلائیزیشن اور عالمی سرمایہ داری کے طلسم سے آزاد ہو رہی ہے۔ وہ پراپیگنڈہ جو سرمایہ دارانہ نظام کے دائمی اور حتمی ہونے کے بارے میں اور اس نظام کے اندر غربت، پسماندگی اور بیروزگاری کے مسائل کے حل ہونے کے حوالے

سے کیا گیا تھا اس کا پردہ فاش ہو رہا ہے۔۔۔۔ دوسری طرف متبادل سوشلسٹ نظام کے علمبرداروں کا یہ کہنا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہی لوٹ، استحصال اور بے دھڑک منافع خوری پر قائم ہے اور اس معیشت کا انسانی اقدار سے براہِ راست تصادم ہے۔ اور پھر یہ کہ یہ نظام جن طبقاتی اور مفاداتی تضادات کو جنم دیتا ہے وہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس نظام کو تبدیل نہ کر دیا جائے۔۔۔ تاریخی طور پر درست ثابت ہو رہے ہیں ۔۔۔۔۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جدوجہد اور غیر استحصالی متبادل نظام کے قیام کی جدوجہد کا عالمی سطح پر تیز تر ہوتے جانا نہایت منطقی ہوگا۔

دنیا بھر میں موجود مختلف ملکوں میں معاشی اور سماجی نظام ایک ہی جیسے اور ایک ہی سطح پر نہیں ہیں چنانچہ ان نظاموں کو بدلنے کی جدوجہد مختلف ملکوں میں مختلف شکلوں میں ہو سکتی ہے۔ پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کے ممالک جو کارپوریٹ گلوبلائزیشن کے ذریعے نوسامراجیت کا شکار ہیں ان کی اس نظام کے خلاف جدوجہد ایک سطح پر تو مشترک ہے تاہم ہر ملک کے اندر اپنے اپنے ملک کے سماجی اور معاشی نظام کو بدلنے کی جدوجہد بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی جدوجہد عالمی نظام کو کمزور بھی کرتی ہے۔

پاکستان میں عالمی قرضوں اور سرمائے کی گرفت سے آزادی، جاگیرداری کے خاتمے، محنت کشوں کے تسلیم شدہ حقوق کی بحالی اور نام نہاد جمہوری نظام جو محض بالائی طبقات کے ہاتھوں استحصال کو جاری رکھنے کا ذریعہ ہے کو عوام کے حق میں بدلنا، سماجی تبدیلی کی اولین شرائط ہیں۔ تبدیلی کا یہ عمل بالآخر ایک ایسا سوشلسٹ معاشرہ تعمیر کرنے میں معاون ہوگا جو 70 سال کے عالمی سوشلسٹ نظام کے تجربے کی بنیاد پر غلطیوں اور خامیوں کو دور کر کے قائم ہوگا۔۔۔۔ اس کام کے لئے پارٹی، اس کی طبقاتی تنظیموں، نوجوانوں طلباء اور خواتین کی انجمنوں کو مضبوط تر کرنا اور تمام ہم خیال جماعتوں اور عناصر سے مضبوط اور بامقصد رشتہ قائم کرنا لازم ہے۔

☆☆☆☆☆

حمید اختر بھی چل بسے

19 اکتوبر کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری اور پاکستان میں بائیں بازو کی ایک مستحکم شناخت جناب حمید اختر 86 برس کی عمر میں ہم سب سے ہمیشہ کے لئے جسمانی طور پر جدا ہو گئے۔ ان کی زندگی نظریاتی اور سیاسی اعتبار سے مستقل مزاجی اور جہد مسلسل کا حوالہ تھی اور رہے گی۔

حمید اختر لدھیانہ میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم حاصل کی اور وہیں سیاست اور ادب کے میدان میں قدم رکھا۔ ساحر لدھیانوی ان کے ہم عصر، دوست اور ہم خیال تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے ہی حمید اختر اپنے شہر سے ہجرت کر کے بمبئی چلے گئے تھے جہاں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوئے اور ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے پرجوش ممبر کے طور پر مصروفِ عمل رہے اور قریباً ایک برس تک انجمن کے اجلاس کی کاروائی رقم کرنے کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ایسی ہی کاروائیوں کا مجموعہ ''رودادِ انجمن'' کے نام سے بعد ازاں پاکستان میں شائع ہوا۔ 47-1946ء کے دوران ادب کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تمام اہم شاعر اور ادیب جو بمبئی میں موجود تھے ان اجلاس میں شریک ہوتے رہے اور ادب، زبان اور سیاست کے تمام اہم مسائل کو زیر بحث لاتے رہے۔ نہ صرف ترقی پسند بلکہ دوسرے بہت سے ادیب جن میں میراجی، پطرس بخاری اور اختر الایمان شامل تھے ان مباحث میں شامل رہے۔ ترقی پسند ادیبوں میں علی سردار جعفری، سجاد ظہیر، سبط حسن، کیفی اعظمی، کرشن چندر اور بہت سے دوسرے شامل تھے۔ چنانچہ حمید اختر ان کے ساتھ بحث و مباحث میں بھی شامل رہے اور ان بحثوں کی کاروائی بھی رقم کرتے رہے ''رودادِ انجمن'' اس لحاظ سے ایک اہم دستاویز ہے۔

پاکستان میں حمید اختر اول روز سے ہی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوئے اور حسب سابق انجمن میں سرگرم رہے۔ 1948 سے 1954ء تک جب پارٹی کو غیر قانونی قرار دیا گیا تو حمید اختر ان تمام نشیب و فراز سے گزرے، پارٹی کے فعال کارکنوں کو جس سے گزرنا پڑا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ جیل گئے۔ جیل ہی کے زمانے میں انہوں نے ''کال کوٹھڑی'' لکھی۔ جب تک فیض صاحب زندہ رہے حمید اختر کا ان سے گہرا تعلق رہا۔

عالمی سطح پر جب سوشلسٹ تحریک بڑے بحران کا شکار ہوئی، سوویت یونین منتشر ہوا اور سوشلسٹ کیمپ ٹوٹ گیا، تو عالمی سرمایہ داری نظام کے نظریہ دانوں اور سامراجی ممالک کے رہنماؤں نے سوشلزم کے خاتمے اور سرمایہ دارانہ معیشت [منڈی کی معیشت] کی دائمی برتری کا اعلان کیا تو کئی سابقہ کمیونسٹ و سوشلسٹ افراد، تحریکیں اور ریاستیں توبہ تائب کے عمل میں گرفتار ہو گئے۔۔۔ حمید اختر اپنے بنیادی نظریات پر قائم رہے، البتہ ایک باہوش اور مارکسزم کی سائنسی منطق سے وابستہ شخص کی حیثیت سے انہوں نے حالات کا تجزیہ بھی کیا اور معروضی حالات میں ترقی پسند نظری اور سیاسی عمل کے راستے بھی تلاش کئے۔ چنانچہ پچھلی دو دہائیوں کے دوران حمید اختر کو جائز طور پر پاکستان میں ترقی پسند تحریک کی شناخت کا معتبر حوالہ سمجھا جاتا تھا۔

حمید اختر کی ذاتی زندگی بھی آخر تک ایک مسلسل جدوجہد سے دوچار رہی۔ ان کی بیگم شدید بیمار رہیں اور وہ ان کے تیماردار رہے۔ وہ خود پہلے گلے اور آخر میں کولون کے کینسر میں مبتلاء رہے اور یہی موذی مرض بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔۔۔۔ معاشی اعتبار سے بھی ان کی زندگی نشیب و فراز سے گزری اور قریب قریب آخر دم تک وہ کالم نویسی کا کام کرتے رہے۔

حمید اختر ہماری تحریک کا ایک طاقت ور ستون تھے۔ ہم اپنا پرچم ان کی یاد میں سرنگوں کرتے ہیں۔

مہاجر سیاست کے بنیادی محرکات

بابر ایاز

سندھ کے سابق وزیر داخلہ ذوالفقار مرزا کی جانب سے الزامات عائد کئے جانے کے بعد ایم کیو ایم کو ایک مشکل صورت حال کا سامنا ہے۔ میرے خیال میں یہ مناسب وقت ہے کہ ایم کیو ایم کے کردار کو سمجھنے کے لئے پاکستان کی سیاست میں عموماً اور سندھ کی سیاست میں بالخصوص مہاجروں کے سیاسی کردار کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔

پچھلے دنوں الطاف حسین کی جانب سے اس خدشے کے اظہار کے بعد یہ تجزیہ اور بھی ضروری ہوگیا ہے کہ انہیں قتل یا خاموش کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ وہ بالواسطہ طور پر امریکہ کی جانب سے پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ وہ ایم کیو ایم کی تنہائی کو ختم کرنے کے لئے خلاف معمول حد تک گئے اور پاکستانی فوج اور سول حکومت کو اس ضمن میں غیر مشروط خدمات کی پیشکش کی۔ مہاجر سیاست کی جزئیات کے حوالے سے تین حصوں پر مشتمل اس تجزیے کے اختتامی آرٹیکل میں ہم ملک کے ٹوٹنے کے بارے میں ایم کیو ایم کے خدشے پر روشنی ڈالیں گے۔

ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں میں رہنے والوں کی ہجرت کے تین بڑے اسباب تھے۔ معاشی ترقی کے مواقع، ذاتی تحفظ جس کو فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے خطرہ تھا اور یہ خام خیالی کہ ہندوستان کے مسلمان ایک قوم ہیں۔

تقسیم کے وقت ہجرت کرنے والے 70 فیصد لوگوں کا تعلق مشرقی پنجاب سے تھا کیونکہ پنجاب ہندوستان کے ان دو صوبوں میں سے ایک تھا جو فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم ہوا، دوسرا صوبہ بنگال تھا۔ چونکہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کرنے والوں کا تعلق ایک ہی نسل اور زبان سے تھا اس لئے ان کی اکثریت مغربی پنجاب میں آباد ہوگئی اور وہ آسانی سے مقامی پنجابیوں میں گھل مل گئے۔

ہجرت کر کے آنے والے باقی لوگوں کا تعلق یو پی، سی پی، بہار، دہلی، حیدر آباد (آندھرا پردیش)، گجرات اور بمبئی وغیرہ جیسے علاقوں سے تھا۔ یہ لوگ ہجرت کر کے سندھ میں آئے کیونکہ: 1۔ بعض حیران کن وجوہات کی بنا پر جناح حکومت نے یہ حکم دیا کہ سندھ پہلے مرحلے میں دو لاکھ تارکین وطن کو قبول کرے گا جبکہ پنجاب کو ایک لاکھ کے لئے کہا گیا۔ دوسرے صوبوں کا کوٹہ اس سے بہت کم تھا۔ 2۔ کراچی کو ملک کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔ 3۔ یہ ایک ایسا کاروباری مرکز تھا جہاں بین الاقوامی بندرگاہ اور ائرپورٹ بھی تھا۔

چنانچہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے زیادتر تارکین بہتر معاشی مواقع کی تلاش کے لئے اس شہر میں آئے۔ کچھ تارکین جنہوں نے ہندوستان کے ساتھ ملنے والی سرحد کو عبور کیا حیدر آباد اور میر پور خاص میں آباد ہوگئے۔ 50ء کی دہائی کے وسط تک کراچی میں ایک ملین سے زیادہ مہاجر آباد ہو چکے تھے جس سے اس شہر کی آبادی کا تناسب یکسر تبدیل ہوگیا۔ ان کی آبادی 60 فیصد سے زیادہ ہوگئی جبکہ سندھیوں کا تناسب 7 فیصد سے بھی کم رہ گیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ کراچی سے سندھی ہندوؤں کی ہندوستان ہجرت تھی۔

مہاجروں نے پہلے 11 سال خوب مزے سے گزارے کیونکہ حکومت میں ان کے پاس ملکی آبادی میں ان کے تناسب سے زیادہ ملازمتیں تھی اور ان کا کاروبار بھی پھلتا پھولتا رہا۔ اگرچہ وہ ملک کی آبادی کا فقط 3.3 فیصد تھے مگر اس کے باوجود پنجاب کی حکمراں اشرافیہ کے جونیئر شراکت دار بننے پر خوش تھے۔ 1951ء میں یہ صورت حال تھی کہ سینئر سول سروسز کے 95 میں سے 33 عہدے مہاجروں اور 40 پنجابیوں کے پاس تھے۔ 1959ء میں فوج کی 48 اعلیٰ ترین پوزیشنوں میں سے 11 مہاجروں کے پاس تھیں جو کل کا 23 فیصد بنتا ہے۔ اسی سال بیوروکریسی میں درجہ اول کے 3532 عہدوں میں سے مہاجروں کا حصہ 1070 تھا جو کل کے 30 فیصد کے مساوی تھا۔ (بحوالہ Language and Politics in Pakistan مصنف طارق رحمٰن صفحہ نمبر 121)۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ مسلم لیگ کی حمایت کرتے تھے جو اس مدت کے دوران زیادہ عرصہ تک حکمرانی کرتی رہی۔

جب جنرل ایوب خان نے منتخب حکومت کو چلتا کر کے مارشل لاء نافذ کر دیا تو مہاجر ابتداء میں اعلیٰ عہدوں سے فائدہ اٹھاتے رہے خاص طور سے سول بیوروکریسی میں انہیں مراعات حاصل رہیں۔ تاہم 60ء کی دہائی شروع ہوتے ہی اقتدار میں مہاجروں کا حصہ کم ہونے لگا۔ ایوب خان کا پہلا حلقہ نیابت ظاہری طور پر فوج تھی جس میں پختونوں کا تناسب 20 فیصد تھا اور پہلی بار ایسا ہوا کہ حکومتی انتظام میں مہاجروں کی جگہ پختونوں کو جونیئر پارٹنر بنا دیا گیا۔

مسلم لیگ، حکومت کے حامی اور حکومت مخالف دھڑوں میں بٹ گئی جبکہ ناراض مہاجروں کی قیادت نے مذہبی جماعتوں کے قریب ہونا شروع کر دیا۔ یہ ترک وطن کر کے آنے والوں کی پہلی نسل تھی اور انہیں دہلی کے چاندنی چوک کی بجائے کراچی کے بندر روڈ پر موجود ہونے کا اخلاقی جواز درکار تھا۔ چنانچہ مذہب کی خدمت سے بڑھ کر اور کون سا اعلیٰ جواز ہو سکتا تھا۔

کوئی شخص یہ کہنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ بہتر معاشی مواقع کی تلاش میں پاکستان آیا ہے کیونکہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں جاگیردارانہ سماجی اقدار ہوں یہ بات بہت معیوب لگتی تھی۔ مذہبی جماعتوں کے ساتھ ان کی وابستگی کا بڑا مقصد ایوب خان کی مخالفت کرنا تھا جنہوں نے طاقت کے توازن کو تبدیل کر دیا تھا۔ وہ ایک سیکولر انسان تھے اور مذہب سے ان کی بہت زیادہ قربت نہیں تھی۔

کراچی میں مہاجروں اور پختونوں کے درمیان نسلی فسادات کی پہلی چنگاری 1965ء کے انتخابات میں کراچی سے گوہر ایوب کی جیت کا جشن منانے کے دوران بھڑکی۔ مہاجر قیادت نے ایوب خان کی مخالفت کر کے محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا تھا۔ ان فسادات میں متعدد افراد مارے گئے تھے۔ اس وقت سے مہاجر برادری، پختونخواہ اور فاٹا سے پختونوں کی سندھ میں نقل مکانی کر کے در آنے کی مخالفت کرتے چلے آرہے ہیں۔ پختون محنت کش زیادہ تر ٹرانسپورٹ اور تعمیرات سے وابستہ ہیں اور یہ ایسے کام ہیں جن سے

مہاجروں کو دلچسپی نہیں ہے۔

جب فوج کی تائید سے 1972ء میں موجودہ پاکستان میں پی پی پی کی جمہوری حکومت آئی تو اقتدار کا توازن ایک بار پھر تبدیل ہو گیا اور سندھیوں کو پہلی بار پنجابی حکمران طبقات کے جونیئر شراکت دار بننے کا موقع ملا۔ سندھ چونکہ اپنی 23 فیصد آبادی کے ساتھ پنجاب کے بعد پاکستان کا دوسرا بڑا صوبہ ہے اس لئے کسی بھی جمہوری ڈھانچے میں یہ توازن جوں کا توں رہے گا۔ اس صورت حال نے مہاجر قیادت کو ایک بار پھر مشتعل کر دیا جس نے پاکستان پیپلز پارٹی جیسی ملک گیر سیاسی جماعتوں کے ساتھ ہاتھ ملانے کی بجائے مذہبی جماعتوں کے پلیٹ فارم سے حکومت کی مخالفت شروع کر دی۔ دوسری طرف سندھ حکومت نے آزادی کے 25 سال بعد پہلی دفعہ سیکرٹریٹ اور اسمبلی کو واپس اپنے ہاتھ میں لے لیا جو تقسیم سے قبل اسی کی ملکیت تھی۔

یہاں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جس سے مہاجروں کے اس غم و غصے کی حد کا اندازہ ہوتا ہے جو انہیں اقتدار کا توازن بدلنے سے ہوا۔ ایک مرتبہ میں اپنے ایک دوست سے ملاقات کے لئے سندھ اسمبلی گیا۔ راہداری سے گزرتے ہوئے میرا سامنا سکھر مسلم لیگ کے دو مہاجر رہنماؤں سید حسن میاں اور اشفاق (پورا نام اب یاد نہیں آ رہا) سے ہو گیا۔ انہوں نے چند سندھی حضرات کی جانب اشارہ کیا جو اپنا روایتی لباس شلوار قمیض اور سندھی ٹوپی پہنے وہاں سے گزر رہے تھے۔ حسن میاں نے انہیں دیکھ کر کہا ''کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ جن لوگوں کو لباس تک پہننے کا سلیقہ نہیں وہ آج اسمبلی میں نظر آ رہے ہیں۔'' وہ چونکہ میرے دوست کے والد تھے اس لئے میں نے بڑے احترام کے ساتھ ان پر واضح کیا ''انکل! کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ صوبہ سندھیوں کا ہے، جنہوں نے ہندوستان سے آنے والے مہاجروں کو پناہ دی۔ پھر انہیں یہاں کیوں نہیں ہونا چاہئے؟'' ان کا فوری جواب یہ تھا ''تم نے کبھی، قوم (مہاجر قوم) کی حمایت نہیں کی۔ طالب علم کی حیثیت سے بھی ایسا نہیں کیا اس لئے تم اس بات کو نہیں سمجھو گے''۔ 1972ء میں 'قوم' کی اصطلاح کے استعمال پر غور کیجئے۔

ایوب خان کی فوجی آمریت میں ہم نے دیکھا کہ سول ایڈمنسٹریشن، مہاجر طلبہ اور سیاسی تنظیمیں بنا کر سندھ کے عوام کو تقسیم کرتی تھی تا کہ بحالی جمہوریت کی تحریک کو کمزور کیا جائے۔ سکھر میں ڈپٹی کمشنر نے اسی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ایوب خان کے خلاف ہماری اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کو تقسیم کر دیا اور حیدر آباد میں کمشنر نے محکمہ اطلاعات کے ایک افسر اشتیاق اظہر کے ذریعے کراچی اور حیدر آباد میں مہاجر پنجابی پختون محاذ قائم کرایا تھا۔ اشتیاق اظہر 1960ء کی دہائی میں مہاجر رابطہ کمیٹی میں شامل ہو گئے اور ایم کیو ایم کی حمایت کرتے رہے۔

مہاجروں کے لئے ایک اور بڑی پریشان کن صورت حال یہ تھی کہ ممتاز بھٹو نے جو بھٹو حکومت میں سندھ کے پہلے وزیر اعلیٰ بنے سندھی کی سرکاری زبان کی حیثیت بحال کر دی اور اسے اسکولوں میں پڑھانے کا حکم دیا۔ اخبار روزنامہ جنگ نے نفرت کو ہوا دینے کے لئے صفحہ اول پر سیاہ حاشیے کے ساتھ یہ سرخی جمائی ''اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے''۔ اس سے سندھ میں پہلی بار بڑے پیمانے پر مہاجر سندھی لسانی فسادات شروع ہوئے۔ مہاجروں اور سندھیوں دونوں نے ایک دوسرے پر حملے کئے جس سے لاتعداد افراد زخمی ہو گئے اور املاک کو آگ لگائی گئی۔

1950ء کی دہائی میں جب کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی اور ذریعہ تعلیم کے لئے اردو یا انگریزی میں سے کسی ایک زبان کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو سندھی لیڈروں نے احتجاج کیا۔ سندھ یونیورسٹی کو حیدر آباد منتقل کر دیا گیا کیونکہ کراچی کو دارالحکومت بنا دیا گیا تھا۔ ہاری لیڈر حیدر بخش جتوئی نے واضح کیا تھا کہ یہ فیصلہ کراچی میں رہنے والے سندھی طلبہ کے لئے مشکلات کا باعث ہوگا۔ لیکن جناح صاحب اور ان کے ساتھی غلط طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اردو کو واحد قومی زبان بنانا ایک مذہب ایک قوم کے مسلم لیگی نظریے کا عملی نتیجہ ہے۔ اس پالیسی نے صوبوں کی دوسری بڑی زبانوں کی مساوی حیثیت کی نفی کی۔ اس طرح سرکاری اور تجارتی ضروریات پوری کرنے کی حامل زبانیں بننے کے لئے ان کے فروغ کی رفتار سست پڑ گئی۔

مہاجر سیاست بھٹو کے بعد

بھٹو حکومت کے خلاف 1977ء کی تحریک میں مہاجروں نے اہم کردار ادا کیا تھا اور جب جنرل ضیاء الحق کی فوجی بغاوت کے نتیجے میں انہیں معزول کر دیا گیا تو یہ لوگ خوش ہوئے۔

سندھ حکومت کی تشکیل اور مرکز میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے قیام نے بالآخر سندھی بولنے والے متوسط طبقے کے لئے دروازے کھول دیے۔ انہیں حکومت اور سرکاری شعبے میں کام کرنے والے خاص طور سے ایسے اداروں میں زیادہ ملازمتیں ملنے لگیں جن کے صدر دفاتر کراچی میں تھے۔ مہاجر بیوروکریسی اور قائدین اس بات کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے کہ ملازمتوں اور معاشی ترقی کے مواقع میں آئندہ ان کا حصہ آبادی کے تناسب سے ہوگا۔ وفاقی حکومت میں کم و بیش 1959ء تک یہی صورت حال تھی۔

ایک بار پھر مہاجروں کو انہی حالات کا سامنا تھا جو وہ ان کے خیال میں ہندوستان کے مسلم اقلیت والے علاقوں میں چھوڑ آئے تھے اور جن کا مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے برطانوی راج میں مسلم لیگی سیاست کی حمایت کی تھی۔ یاد کیجئے سرسید احمد خان نے مسلمانوں کے لئے ملازمتوں میں 50 فیصد حصہ مانگا تھا حالانکہ یوپی کی آبادی میں ان کا تناسب 13 فیصد تھا۔

یہی وہ بڑی وجہ تھی کہ مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں نے مسلم لیگ کی تحریک کے دوران ہراول کردار ادا کیا، باوجود اس کے کہ بالآخر یہ تحریک مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں پاکستان کے مطالبے میں تبدیل ہو گئی۔ یہ تحریک (جیسا کہ حمزہ علوی نے قائل کر دینے والے انداز میں وضاحت کی ہے) لوگوں کے اس طبقے نے شروع کی تھی جنہوں نے نو آبادیاتی ریاستی اداروں میں ملازمتوں کے لئے کوالیفائی کرنے کی خاطر باضابطہ تعلیم حاصل کی تھی۔ علوی کے مطابق 1857ء میں یوپی میں مسلمانوں کی آبادی 13 فیصد تھی مگر ان کے پاس 64 فیصد ملازمتیں تھیں۔ تاہم برطانوی قبضے کے بعد 1913ء تک ان کا یہ حصہ کم ہو کر 35 فیصد رہ گیا۔

جب پاکستان بنانے کا مطالبہ مان لیا گیا تو تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد درحقیقت بہتر مواقع کی تلاش میں پاکستان آئی۔ یہاں پاؤں جما لینے کے بعد انہوں نے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو یہاں بلایا۔ سندھ کی صوبے کی حیثیت سے بحالی کے بعد وہ ایک بار پھر ملازمتوں اور معاشی مواقع میں کم ہوتے ہوئے حصے کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ انھوں نے سندھ میں متروکہ املاک کا بھی بڑا حصہ حاصل کیا۔

تاہم جب اقتدار سندھیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہونا شروع ہوا تو مہاجروں سے پھر امتیازی سلوک ہونے لگا۔ مگر پرانے دور کے اچھے وقت میں جب پنجابیوں اور مہاجروں کے پاس اسٹیبلشمنٹ میں ملازمتوں کا دوسرا سب سے بڑا حصہ تھا سندھیوں سے امتیازی سلوک ہوتا رہا۔ آج بھی اگر سرکاری شعبے کو شامل کیا جائے تو حکومتی ملازمتوں میں مہاجروں کے پاس آبادی میں ان کے 7.5 فیصد حصے کے مقابلے میں کہیں زیادہ نوکریاں ہیں۔

1985ء میں بس کے ایک حادثے میں بشریٰ زیدی کی ہلاکت سے ان پختونوں کے خلاف تشدد کی لہر شروع ہوگئی جن کے پاس ایوب دور کی اقربا پروری کے طفیل کراچی کے ٹرانسپورٹ سیکٹر کا کنٹرول تھا۔ ڈرائیوروں کے غیر مہذب رویے اور بسوں و منی بسوں کو اندھا دھند چلانے کی وجہ سے آئے روز حادثات کے باعث لوگوں کے دلوں میں پہلے سے غم وغصہ موجود تھا۔ ناکافی پبلک ٹرانسپورٹ پہلے بھی اہلیان کراچی کے لئے وجہ اضطراب تھی اور آج بھی ہے۔ مہاجروں جن کی سب سے زیادہ تعداد بسوں سے سفر کرتی ہے بسوں کو آگ لگانا شروع کر دی۔ جوابی کاروائی کے طور پر پختونوں نے بعض مہاجر بستیوں پر حملے کئے اور جلد ہی ایک ایسا فوری ردعمل جو ایک حادثے کی وجہ سے شروع ہوا تھا قابل نفرت نسلی تنازع میں تبدیل ہوگیا جس میں متعدد جانیں ضائع ہوگئیں۔

اسی اثناء میں مہاجر نوجوانوں نے جو سرزمین سندھ کے یکساں سپوت ہیں کیونکہ انہوں نے اسی صوبہ میں جنم لیا اور پرورش پائی، بیروزگاری اور تعلیمی اداروں کی کمی کے عذاب کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔ بھٹو نے 1972ء میں تمام تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے بعد کراچی میں کوئی ایک بھی نیا کالج قائم نہ ہوا۔ 1970ء کی دہائی کے آخر سے 1980ء کی دہائی کے وسط تک ہر سال اوسطاً 20 ہزار طلبہ ایسے تھے جنہیں میٹرک میں نچلے گریڈز میں پاس ہونے کی وجہ سے کسی کالج یا فنی تعلیم کے ادارے میں داخلہ نہیں مل سکا تھا۔ گلی محلوں کے نکڑ پر بے مقصد کھڑے رہنے والے بیروزگار نوجوانوں کا یہی وہ ہجوم تھا جسے الطاف حسین اور عظیم احمد طارق نے آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (APMSO) قائم کر کے زبان دی۔ عظیم طارق نے جب ایم کیو ایم کو چھوڑ دیا تو کچھ دن بعد انہیں قتل کر دیا گیا۔

خود الطاف حسین نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ جب وہ بی ایس سی فارمیسی میں داخلہ لینے کے لئے کراچی یونیورسٹی گئے تو انہیں مختلف لسانی تنظیموں کے خیر سگالی بینرز دیکھ کر دھچکا لگا اور وہ خود اپنی شناخت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوگئے۔ اس وقت تک مہاجر طلبہ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بائیں بازو کے گروپوں یا جماعت اسلامی کے دائیں بازو کے طلبہ ونگ اسلامی جمعیت طلبہ (IJT) کا نظریات کی بنیاد پر ساتھ دیتے تھے۔ ایک مہاجر تنظیم کی تشکیل کو مکار ضیاء الحق کی انٹیلی جنس نے ہاتھوں ہاتھ لیا جس کا خیال تھا کہ فوجی حکومت کی جانب سے بھٹو کو پھانسی پر لٹکانے کے بعد یہ بڑھتی ہوئی سندھی قوم پرستی کا توڑ ثابت ہوگی۔

طلبہ کی نسلی بنیادوں پر تقسیم نے APMSO کے بانیوں کے ذہن میں یہ سوال اٹھا دیا کہ ان کی شناخت کیا ہے؟ ان کی پرانی نسل نے انہیں یہ بتایا کہ تمام پاکستانی واحد مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ مہاجروں کی دوسری نسل کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ انہیں پاکستان میں رہنے کے لئے مذہبی سہاروں کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے گردوپیش بڑھتی ہوئی نسلی سیاست نے ان میں یہ سوچ پیدا کر دی کہ واحد مسلم قوم جیسی کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ مضبوط نسلی بنیادوں پر سیاست ہی وقت کا تقاضا ہے۔ الطاف حسین نے 15 دسمبر 1980ء کو جامعہ کراچی میں APMSO کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مہاجروں کو پاکستان کی پانچویں قومیت تسلیم کیا جانا چاہئے۔ اس طرح وہ پرانی مہاجر نسل کی سوچ سے دور ہٹ گئے جو بائیں بازو کی سوچ رکھنے والے کچھ لوگوں کو چھوڑ کر ہمیشہ سختی کے ساتھ اس بات کی دعویدار رہی کہ پاکستان ایک قوم ہے اور جو یہ مسئلہ اٹھاتے ہیں کہ اس ملک میں چار قومیتیں بستی ہیں وہ غدار ہیں اور یہودیوں اور ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں۔

تاہم بعد میں ایم کیو ایم پانچویں قومیت کے نعرے سے سرکاری طور پر دستبردار ہوگئی اور اعلان کیا کہ مہاجر اردو بولنے والے سندھی ہیں۔ الطاف حسین نے 10 ستمبر 2011ء کو اپنی طویل پریس کانفرنس میں اس موقف کا اعادہ کیا۔ 1980ء کے عشرے کے اوائل میں سندھی قوم پرستوں نے بھی یہی مشورہ دیا تھا۔ مگر اس سرکاری اعلان کے باوجود ایم کیو ایم کو نجی طور پر اپنی پہلے والی اس سیاسی سوچ پر کاربند رہنا پڑا کہ مہاجر الگ قوم ہیں۔ اس کا مقصد اپنے ووٹ بنک کو متحد رکھنا تھا۔ انتخابی حلقوں کی سیاست ایم کیو ایم کو آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایم کیو ایم کا تحریری شکل میں موجود مواد ظاہر کرتا ہے کہ الطاف حسین اور عظیم طارق دونوں نے اس نظریے کو مسترد کر دیا تھا کہ مسلمان مشترک مذہب کی بنیاد پر ایک قوم ہیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر مذہب نے تمام مسلمانوں کو ایک قوم بنا دیا ہے تو پھر بہت سے ملکوں میں وہ قومیت کی بنیاد پر تقسیم کیوں ہیں۔ APMSO کے سیکرٹری جنرل عظیم احمد طارق نے دسمبر 1980ء میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا ''قیام پاکستان کے فوراً بعد نظریۂ پاکستان یا نظریۂ اسلام کی نفی کی گئی کیونکہ 1954ء میں ہندوستان کے مسلم اقلیت والے علاقوں کے مسلمانوں کو جو نقل مکانی کے مرحلے سے گزر رہے تھے پاکستان کی سرحد پر روک کر واپس بھیج دیا گیا''۔ (ایم کیو ایم کا کتابچہ 'مہاجر قومی موومنٹ۔۔۔ تشکیل اور جدوجہد' تدوین احمد سلیم)۔

ایم کیو ایم کے لیڈروں نے تحریک پاکستان کی بنیادی دلیل کو جرأت کے ساتھ بے نقاب کیا۔ انہوں نے سوال کیا کہ اگر مسلمان ایک قوم ہیں تو پھر دنیا کے کسی بھی ملک خاص طور پر بھارت کے مسلمانوں کو کیونکر کسی مخصوص وقت پر پاکستان میں داخل ہونے سے روکا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بڑے حوصلے کے

باقی صفحہ نمبر 8 پر

ایم کیو ایم کا مستقبل

بابر ایاز

کیا ذوالفقار مرزا کے اٹھائے ہوئے طوفان نے ایم کیو ایم کو وقتی طور پر اپنے جارحانہ حربوں کو تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے؟ یا مرزا کی بھرپور تنقید اور بعض دوسرے پس پردہ واقعات ایم کیو ایم کی سیاسی حکمت عملی کو تبدیل کر دیں گے؟ اگر مرزا کی باتوں کے بارے میں محتاط رویہ محض سیاسی چال کے طور پر ایک قدم پیچھے ہٹنا ہے تو پھر کراچی کے بہی خواہوں کو زیادہ خوش نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن اگر دوسری بات صحیح ہے اور ایم کیو ایم اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کر رہی ہے تو یہ نہ صرف پارٹی بلکہ ملک کے لئے بھی بہتر ہوگا۔

بدقسمتی سے الطاف حسین کی طویل پریس کانفرنس اس یقین کا اعادہ نہیں کرتی کہ ایم کیو ایم اپنی حکمت عملی کو تبدیل کرے گی اور وہ مختلف نسلی پس منظر رکھنے والے متوسط طبقات کی پارٹی کے طور پر ابھرنے کی اپنی خواہش کو تباہ کرنا چھوڑ دے گی۔ تاہم اس بات کا احساس کرتے ہوئے کہ ایم کیو ایم سیاسی طور پر تنہا ہو رہی ہے اس کے قائد نے بڑی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مرزا کے اس الزام کا براہ راست جواب نہیں دیا کہ انھوں نے مرزا کو اعتماد میں لے کر کہا تھا کہ امریکہ پاکستان کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے اور ایم کیو ایم اس کا ساتھ دے گی۔ اس کے برعکس ایم کیو ایم کے سپریم لیڈر نے اپنا زیادہ وقت پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو از سر نو یہ باور کرانے پر صرف کیا کہ ان کی جماعت پاکستان کو توڑنے کی کسی سازش کو ناکام بنانے میں مکمل تعاون کرے گی۔ ماضی میں شائع ہونے والی کتابوں اور امریکی تجزیہ کاروں کے متعدد آرٹیکلز کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اس حلقے کا ساتھ دیا جو یہ کہتا رہا ہے کہ امریکی پاکستان کو توڑنا چاہتے ہیں۔

اگرچہ ایم کیو ایم کے لیڈر مصطفیٰ کمال اس بات کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ ان کی پارٹی کا کوئی عسکری ونگ ہے مگر اس ملک کے لوگوں کی سوچ اس کے برعکس ہے۔ نائن زیرو سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس پر صرف ایم کیو ایم کے ووٹر ہی یقین کرتے ہیں۔ اگر اس سوچ کو غلط ثابت کرنا ہے تو طویل تقریروں اور جوش خطابت سے ایسا نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے مستقبل کی حکمت عملی میں تبدیلی لانا ہوگی۔

کراچی، حیدرآباد، سکھر اور میرپور خاص کے مضافات ہی نہیں بلکہ شہری مراکز میں بھی ایم کیو ایم کے پاس متوسط اور نچلے طبقے کی مضبوط بنیاد موجود ہے۔ دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ اپنے ووٹ بینک کے حقوق پر غیر متشدد طریقوں سے بات کرنے اور سودے بازی کے لئے یہ کافی طاقت ہے۔ اسے کسی عسکری ونگ پر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب وہ پاکستان کی دوسری نسلی و لسانی برادریوں کے متوسط اور نچلے متوسط طبقوں کو اپنی جانب راغب کرنا چاہتی ہو۔ دوسری جماعتوں کی جانب سے اشتعال کے باوجود مسلسل تشدد سے پاک سیاست ہی ایم کیو ایم کے بارے میں موجودہ تاثر کو تبدیل کرنے میں اس کی مدد کرے گی۔

ایم کیو ایم کا کہنا ہے کہ اس کے بارے میں یہ تاثر ان سیاسی جماعتوں اور قومیتوں کا پیدا کردہ ہے جو پاکستان کی حکمراں اشرافیہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مگر ایک ایسی جماعت کی حیثیت سے جس کے حامیوں میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے لوگ شامل ہیں اسے یہ سمجھنا ہوگا کہ تصورات حقیقت سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور یہ یکسر بے بنیاد بھی نہیں ہیں۔

ایم کیو ایم کے لیڈر اور نظریے کے مبلغ الطاف حسین نے 2003ء میں ''حقیقت پسندی اور عملیت پسندی'' پر اپنے کارکنوں کو ایک لیکچر دیا تھا۔ انھوں نے عملیت پسندی کی تعریف اس طرح کی تھی ''حقیقت (حقائق) کی اصلی روح اور جذبے کے مطابق کام کرنے، فیصلہ سازی اور اس کے لئے طریقے اختیار کرنے کو عملیت پسندی کہا جاتا ہے اور اسی حقیقت پسندی کو عملیت پسندی کہتے ہیں۔''

یہی وہ خاص بات ہے جس پر ایم کیو ایم عمل نہیں کر رہی۔ ذرا کراچی کی آبادی کے تناسب پر نظر ڈالئے۔ بین الاقوامی اعداد و شمار کے مطابق اس شہر کی مجموعی آبادی 15.7 ملین ہے اور اسے دنیا کے 13 ویں سب سے بڑے شہر کا درجہ حاصل ہے تاہم اگر 1998ء کی مردم شماری کے قریب رہا جائے جیسا کہ محکمہ مردم شماری کے اعداد و شمار ہیں تو 3.5 فیصد کی سرکاری شرح افزائش کی بنیاد پر یہ آبادی 14.3 ملین ہونی چاہئے۔

مگر ایم کیو ایم کا کہنا ہے کہ شہر کی آبادی کہیں زیادہ ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ یہ کس طرح اتنی زیادہ تعداد شمار کرتے ہیں۔ شہریوں میں شرح افزائش کے کم و بیش دو عنصر ہوتے ہیں: فطری افزائش جو 1.9 فیصد کے قریب ہے کیونکہ شہری مراکز میں یہ قومی اوسط سے عموماً نیچے رہتی ہے۔ اور دوسرا طریقہ نقل مکانی ہے جس کا تخمینہ کراچی کے حوالے سے 1.5 فیصد ہے۔ چنانچہ 1998ء کی مردم شماری کی بنیاد پر افزائش نسل کی شرح بالکل حقیقت پسندانہ نظر آتی ہے۔ اب 1998ء کے آبادی کے جائزے میں مختلف زبانیں بولنے والے طبقات کے اعداد و شمار دیکھئے: اردو بولنے والے 48.52 فیصد، پنجابی 13.64 فیصد، پٹھان 11.96 فیصد، سندھی صرف 7.34 فیصد، بلوچ 4.34 فیصد، سرائیکی 2.11 فیصد اور باقی زبانیں بولنے والے 12.09 فیصد۔ ان باقی زبانیں بولنے والوں میں گجراتی اور دوسری برادریاں شامل ہیں۔ تاہم پختون دعویٰ کرتے ہیں کہ اب ان کی تعداد زیادہ ہے۔ لیکن پختون کارکنوں کی بڑی تعداد کراچی میں صرف رہتی ہے کراچی میں ووٹروں کی حیثیت سے ان کا اندراج نہیں ہے۔ اسی طرح ایم کیو ایم بھی یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ گجراتی بولنے والے اس کا حصہ ہیں کیونکہ ان کی نوجوان نسل اردو بولتی ہے۔

پچھلے 13 سالوں کے دوران سندھیوں اور پختونوں کی ایک بڑی تعداد کراچی منتقل ہوئی ہے اور اس لئے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگلے الیکشن میں کراچی سے ان کے پاس زیادہ نشستیں ہونی چاہئیں۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ بڑے شہروں کو ایک ایسی بھٹی کی مانند ہونا چاہئے جس میں پگھل کر سب ایک ہو جائیں اور رائے دہندگان کو غیر نسلی بنیاد پر ووٹ دینا چاہئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کراچی میں پی پی پی، جماعت اسلامی اور پاکستان مسلم لیگ کے سوا دوسری تمام جماعتوں کو نسلی

بنیادوں پر ووٹ دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ کراچی میں اردو بولنے والوں کی تعداد 50 فیصد سے زیادہ نہیں ہے دوسرے نسلی گروپ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی نمائندگی کم ہے کیونکہ زیادہ تر انتخابی حلقے اس طرح سے بنائے جاتے ہیں کہ جو ایم کیو ایم کی ضروریات کے مطابق ہیں۔ اے این پی دعویٰ کرتی ہے کہ کراچی میں پختونوں کی آبادی 20 فیصد سے زیادہ ہے جو صاف مبالغہ آرائی ہے۔

عملیت پسند ہونے اور پورے پاکستان کے مختلف النسل متوسط طبقوں کی پارٹی بننے کا طویل المدت مقصد حاصل کرنے کے لئے ایم کیو ایم کو اپنی حکمت عملی تبدیل کرنی چاہئے۔ اسے خوش دلی کے ساتھ دوسری نسلی آبادیوں کو کراچی کا حصہ دار بنانا چاہئے۔ اس طرح ایک ایسی پارٹی کی حیثیت سے اس کی ساکھ قائم ہوگی جو تحمل اور رواداری سے کام لیتی ہے۔ جب کہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ خواہ اسے دیوار سے لگا دیا گیا، جیسا کہ مصطفیٰ کمال کہتے ہیں یا وہ اپنے عسکری ونگ کو کراچی کا امن وامان تباہ کرنے کی اجازت دے، حقیقت یہ ہے کہ اس نے خود کو تنہا کر لیا ہے۔

جذبات سے مغلوب ذوالفقار مرزا ہی کی بات نہیں ہے دوسری تمام جماعتیں، میڈیا اور نسلی ولسانی برادریاں بھی ایم کیو ایم پر کڑی تنقید کرتی ہیں۔ یہی حقیقت پسندی ہے اور 'عملیت پسندی' یہ ہے کہ پیچھے ہٹا جائے اور ملک کے بہتر اور طویل المدت مستقبل کی خاطر خاص طور سے کراچی میں رہنے والوں کا سوچتے ہوئے موجودہ حکمت عملی کو تبدیل کیا جائے۔ اگر کراچی کا نقصان ہوتا ہے تو کسی بھی دوسرے شخص کے مقابلے میں مہاجر نوجوانوں کا زیادہ نقصان ہوتا ہے کیونکہ انہیں اسی شہر میں تعلیم حاصل کرنی اور ملازمت تلاش کرنی ہے۔

ایم کیو ایم کے لیڈر کراچی اور حیدر آباد کے انتخابی میدان میں سندھیوں اور پختونوں سے لڑتے رہے ہیں حالانکہ شہر میں امن وامان ان کے بہترین مفاد میں ہے۔ شہر میں امن و امان کی صورت حال سے خوفزدہ ہو کر نجی شعبہ اپنے کاروبار کو پنجاب، خلیجی ممالک، سری لنکا اور بنگلہ دیش کی طرف منتقل کر رہے ہیں۔ مہاجر لیڈر اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آج ہم ایک ایسے زمانے میں رہ رہے ہیں جہاں حکومتوں کا حجم کم ہو رہا ہے اور مہاجر نوجوانوں کے لئے ملازمتیں پرائیویٹ سیکٹر میں ہی رہ گئی ہیں۔ یہ وہ شعبہ ہے جہاں کسی کا کوٹہ نہیں ہوتا بلکہ صرف میرٹ کام آتا ہے اور یہ بات ایم کیو ایم کو نا گوار گزرتی ہے۔ مہاجر نوجوانوں کو اپنی قابلیت کو بڑھانے کا راستہ نہیں دکھایا گیا بلکہ انھیں یہ لیکچر دئے جا رہے ہیں کہ دوسری برادریاں ان کا حق چھین رہی ہیں اور ان کے ہاتھ میں اسلحہ تھمایا جا رہا ہے۔

مہاجر لیڈروں کی اس پالیسی کا اثر اس طرح دیکھا جا سکتا ہے کہ بندوق کی نال پر بڑھتے ہوئے انحصار کے مقابلے میں مہاجر نوجوانوں کی تعلیمی قابلیت مسلسل کم ہو رہی ہے۔ ایم کیو ایم کے لیڈر اس بات کی سختی کے ساتھ تردید کرتے ہیں کہ وہ تشدد کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں مگر اس کے ساتھ وہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ دوسری نسلی اور لسانی قوتوں کے جارحانہ اقدامات کے خلاف نوجوان اپنے دفاع میں بندوق اٹھاتے ہیں۔

الطاف حسین نے بالکل درست کہا تھا کہ اسلام کے نام پر پاکستان کا قیام غلطی تھی مگر اب جبکہ 1971ء کے بعد بھی اتنے عرصہ تک پاکستان موجودہ شکل میں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے تو اس کو توڑنا کہیں زیادہ بڑی غلطی ہوگی اور بہت زیادہ خون خرابہ بھی ہوگا کیونکہ پل کے نیچے سے بہت زیادہ پانی گزر چکا ہے اور پاکستان کی مختلف نسلی ولسانی برادریوں کے درمیان کئی مشترکہ مفادات قائم ہو چکے ہیں۔ ایک دوسرے کے زیادہ احترام، برابری اور پاکستان میں رہنے والی مختلف قومیتوں کو تسلیم کرنے سے اب پاکستان اپنا وجود برقرار رکھنے والا ملک بن چکا ہے۔

جہاں تک ان مختلف تجزیوں کا تعلق ہے جن میں پاکستان، افغانستان اور ایران کو توڑنے کی تجویز دی گئی ہے تو دراصل یہ ایک مختلف نسل سے تعلق رکھنے والے تجزیہ نگاروں کی منظر کشی ہے۔ مگر دوسری طرف ان لاتعداد کتابوں اور تجزیوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جن میں خبردار کیا گیا ہے کہ پاکستان کو توڑنے کی صورت میں کس طرح بھارت سمیت پورا علاقہ غیر مستحکم ہو جائے گا۔ اور یہ وہ علاقہ ہے جس میں تباہ کن جوہری ہتھیار بھی موجود ہیں۔ (تیسری قسط آئندہ شمارے میں شائع ہوگی)۔

بقیہ: مہاجر سیاست

ساتھ اسرائیل کے طریقہ کار کا حوالہ دیا جہاں دنیا کا کوئی بھی یہودی جا کر اسرائیلی قومیت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ اس لحاظ سے جرأت مندی ہے کہ یہاں عوام کی اکثریت اسرائیل کے ساتھ پاکستان کے موازنے کو قابل مذمت سمجھتی ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جس کی بنیاد پر الطاف حسین نے کئی موقعوں پر کہا کہ "پاکستان قائم کرنا غلطی تھی" (The Idea of Pakistan by Stephen P Cohen)۔

الطاف حسین کی قیادت میں مہاجروں کی نوجوان لیڈر شپ نے یہ اعلان کر کے دانشمندی کا راستہ اختیار کیا تھا کہ وہ صوبے کی تقسیم نہیں چاہتے۔ وہ اس موقف پر بدستور آج بھی قائم ہیں۔ انہوں نے نیشنل فنانس کمیشن میں سندھ کے اہم مطالبات اور پانی کی تقسیم کے معاملے کی حمایت کی۔ وہ ایک طرف بجا طور سے پنجاب کی بالادستی کے خلاف سندھ کے موقف کی حمایت کر رہے ہیں مگر صوبے کے اندر ایم کیو ایم دو بڑے شہروں کراچی اور حیدر آباد کا کنٹرول مانگ رہی ہے۔ الطاف حسین کی حالیہ تصنیف "My Life's Journey" کے پیش لفظ میں پروفیسر متھیو اے کک نے بجا طور پر واضح کیا "رد کرنے کے اصول سے مہاجروں اور سندھیوں کے درمیان ایک سے دوسرے تاریخی بحران پر تناؤ بھی نظر آتا ہے (نقل بمطابق اصل) اس کے باوجود مہاجر سیاست نہ صرف یہ واضح کرتی ہے کہ ایک چیز کو رد کرنے سے کس طرح متبادل پیدا ہوتے ہیں بلکہ سماجی ومعاشی مکالمہ شروع کرنے سے بہت سی چیزوں میں مشابہت نظر آنے کا امکان بھی ہوتا ہے۔"

سندھ میں پی پی پی اور ایم کیو ایم کا اتحاد ان دونوں جماعتوں کے درمیان اسی متبادل اور مشابہت کا شکار ہے جو سندھی بولنے والے سندھیوں اور اردو بولنے والے سندھیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ افسوس ناک بات ہے کہ چند سال پہلے سرکاری طور پر اس اعلان کے باوجود کہ ایم کیو ایم میں "ایم" کا مطلب متحدہ ہے مہاجر نہیں ہے، اس جماعت کی قیادت ان دونوں مفاہیم کے درمیان تذبذب میں مبتلا ہے جو ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے۔ (جاری ہے)

ترقی پسند تحریک ۔۔۔ سفر در سفر

مسلم شمیم

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے 2011ء کا سال کئی حوالوں سے بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سال مذکورہ تحریک کی پلاٹینم جوبلی کا سال ہے، فیض صدی کا سال اور مجاز لکھنوی صدی کا سال ہے۔ فیض صدی کی تقریبات کا آغاز یکم جنوری 2011ء کو علی گڑھ سے ہوا اور 26 فروری 2011ء کو دہلی میں سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے منعقد ہوئی جس کے افتتاحی اجلاس سے صدرِ جمہوریۂ ہند محترمہ پرتیبھا پاٹل نے خطاب کیا اور فیض کو عالمی امن کے فروغ کے حوالے سے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اِس کانفرنس میں دیگر ممالک کے علاوہ ایک وفد پاکستان سے بھی شریک ہوا تھا۔ فیض صدی کی تقریبات کا سلسلہ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ روس، کینیڈا، امریکا اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھی جاری ہے۔ پاکستان کے مختلف شہروں خصوصاً لاہور اور کراچی میں وسیع پیمانے پر فیض صدی کی تقریبات منعقد ہو چکی ہیں۔ ماضیٔ قریب میں کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ پاکستان اسٹڈی سنٹر کے زیرِ اہتمام سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی۔ اِس کانفرنس میں ہندوستان سے چار رکنی وفد شریک ہوا جس میں الٰہ آباد سے تعلق رکھنے والے انجمنِ ترقی پسند مصنفین ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر علی احمد فاطمی بھی شامل تھے جنھوں نے یہ خبر دی کہ انجمن کی پلاٹینم جوبلی کی تقریبات دہلی میں دسمبر 2011ء کی آخری تاریخوں میں منعقد ہونے جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی کتاب 'ترقی پسند تحریک۔ سفر در سفر' مذکورہ پلاٹینم جوبلی کے تاریخی واقعے کے اعتبار سے بڑی معنویت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی سے میرا عرصۂ شناسائی و آشنائی ربع صدی پر محیط ہے۔ مجھے اُن سے مختلف موقعوں پر تبادلۂ خیالات کے مواقع میسر آئے۔ اُن کی نگارشات میرے زیرِ مطالعہ رہی ہیں۔ اُن کے مجموعی ادبی اثاثوں سے میں بخوبی با خبر ہوں۔ اُن کے علمی تجزیے اور اُن کی فکری جہات سے بھی آگاہی کا دعوے دار ہوں۔ اِن سب کے باوصف اُن سے فکری اور نظریاتی رشتوں اور قربتوں کی ایک انجمن میرے اندر آباد ہے۔ یہ احساسِ قربت و یگانگی ترقی پسند تحریک اور نظریے سے اُن کی غیر معمولی وابستگی کی دین ہے یعنی ایک ہی منزل کے راہی اور ہم سفر ہونے کا احساس۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی سے قربتوں اور رشتوں کا ایک بڑا وسیلہ ڈاکٹر قمر رئیس سے اُن کی قربت اور ترقی پسند کاز (cause) کے لیے اُن کا عشق ہے۔ جب تک زندہ رہے، اُن سے میرا رابطہ رہا، ملاقاتیں رہیں، کراچی میں بھی اور دہلی میں بھی۔ ترقی پسند تحریک کے احیا اور نشاۃِ ثانیہ کے باب میں اُن کی گراں قدر خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے نظریاتی وارث ڈاکٹر علی احمد فاطمی ترقی پسند تحریک اور اُس کے آدرش کے فروغ کے لیے ایک عرصے سے مصروفِ عمل ہیں۔ 'ترقی پسند تحریک۔ سفر در سفر' ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے اِسی عشق کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب بقولِ صاحبِ کتاب سجاد ظہیر صدی کے موقع پر پیش کی گئی تھی۔ مذکورہ کتاب کی تقریبِ تعارف فیض صدی کے موقع پر 10 ستمبر 2011ء کو ہوئی جس کی تقریبات میں شرکت کے لیے وہ یہاں اِن دنوں آئے ہوئے تھے۔ فیض صدی کی تقریبات میں وہ اپنے خطابات میں فیض کی شاعرانہ عظمت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک اور نظریے کی عالمانہ وکالت سے شرکائے اجلاس کو متاثر کر چکے ہیں کیونکہ اُن کے پیشِ نظر یہ بات ہمیشہ رہی ہے کہ فیض کی کثیر الجہت شاعرانہ عظمت کا سرچشمہ وہ ترقی پسند تحریک رہی ہے جس کے بانیوں میں سے وہ ایک ہیں۔ اِسے حُسنِ اتفاق کہیے کہ ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی یہ کتاب جہاں فیض صدی میں موضوعِ گفتگو بن رہی ہے وہاں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی پلاٹینم جوبلی کے سال کی بھی ایک اہم کتاب کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔ فیض صدی کی تقریبات جو بین الاقوامی سطح پر بڑے وسیع پیمانے پر منائی جا رہی ہیں اُن کی صدائے بازگشت میں انجمن کی پلاٹینم جوبلی کے چرچے ابھی تک اُس نہج پر نہیں ہو رہے ہیں جس کا یہ تاریخی واقعہ متقاضی ہے۔ ۲۰۱۱ 2011ء کا سال فیض صدی اور انجمن کی پلاٹینم جوبلی سال ہونے کے ساتھ مجاز صدی کا بھی سال ہے۔ واضح رہے کہ اسرار الحق مجاز 19 اکتوبر 1911ء کو اپنے آبائی وطن ردولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے تھے جو لکھنؤ سے پچپن میل کے فاصلے پر ہے۔ مجاز لکھنوی ترقی پسند تحریک کے اہم ناموں میں سے ایک نام ہے، اُنھیں نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

یہ طمانیت کی بات ہے کہ ہندوستان میں سجاد ظہیر صدی کے علاوہ متعدد عمائدینِ تحریک کی صد سالہ تقریبات منعقد ہوئی ہیں جن میں ڈاکٹر عبدالعلیم کا نام نامی بھی شامل ہے جن کی گراں قدر خدمات اور کارگزاریاں ترقی پسند تحریک کی تاریخ کے ابوابِ زریں میں شامل ہیں اِس تناظر میں مجاز لکھنوی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف مجاز صدی کی تقریبات کے انعقاد کے ذریعے کیا جانا چاہیے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی کتاب 'ترقی پسند تحریک۔ سفر در سفر' میں جہاں خود ترقی پسند تحریک پر اجمالی روشنی ڈالی گئی ہے اور اُس کی ادبی خدمات اور کارناموں کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے وہاں یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ کتاب فیض احمد فیض اور مجاز لکھنوی یعنی دونوں کے ذکرِ خیر اور اعترافِ فکر و فن سے محروم ہے۔ اِس ضمن میں کیا بات حائل رہی وہ ڈاکٹر علی احمد فاطمی ہی بہتر طور پر بتا سکتے ہیں۔ بہر حال فیض کے حوالے سے اُن کے حالیہ دو پُرمغز مقالات اور صدارتی خطبہ بڑی اہمیت اور معنویت کے حامل کہے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں زیرِ نظر کتاب 'ترقی پسند تحریک۔ سفر در سفر' ترقی پسند تحریک کے ارتقائی سفر کے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اِس کتاب اور نظریے کو اکیسویں صدی کے بدلے ہوئے سماجی منظر نامے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے اظہار کا موضوع بنایا ہے اور ترقی پسند تحریک کی ہمہ گیریت اور آفاقیت کا بڑی وسیع النظری کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے واضح ترین

الفاظ میں اِس ضمن میں dogmatic approach کو مسترد کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور فکر کے سرچشموں کو اُنھوں نے میر تقی میرؔ، غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ سے منسوب کر کے اِس تحریک اور نظریے کے ارتقائی مراحل کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ میرے نزدیک ترقی پسندیت اور ترقی پسند تحریک کی کہانی دراصل سماجی ارتقا کی کہانی کا اٹوٹ انگ ہے۔ سماجی زندگی کے آغازِ سفر سے ہی اِس کہانی کی ابتدا ہوئی ہے۔

انسان جنگل اور غاروں سے نکل کر کھیتی باڑی کے دور میں آیا اور ایک عرصۂ دراز تک کلی طور پر اجتماعی سماجی زندگی یعنی ابتدائی اشتراکیت (primitive communism) کے عہد میں رہا اور یہ عرصۂ تاریخ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ اِس سماجی عمل میں جب نجی ملکیت نے جنم لیا تو غیر طبقاتی سماج طبقاتی سماج میں بدل گیا اور یہیں سے طبقاتی کش مکش اور آویزش کا سلسلہ شروع ہوا۔ طبقاتی کشمکش کی تاریخ دراصل سماج میں ترقی پسند قوتوں اور رجعت پسند قوتوں کے درمیان کشمکش، آویزش اور جدوجہد کی تاریخ ہے۔، اِس کو معرکۂ خیر و شر بھی سمجھنا چاہیے جس سے نبرد آزما ہوتے ہوئے سماج سفرِ ارتقا پر گامزن ہے۔ سماجی ارتقا تغیر و ترقی اور انقلابات کے مراحل سے دوچار ہوتا ہوا قانونِ فطرت کی عمل داری میں سرخروئی کی منزلوں سے ہم کنار ہوتا آیا ہے۔ انسان اور انسانی تمدن و تہذیب کا سفر ہمیشہ سے پیش رفت کا سفر رہا ہے۔ سماجی زندگی کبھی زوال پذیر نہیں ہوئی۔ شعور و فکر اور ترقی کا سورج کبھی ایک خطۂ ارضی پر روشن رہا تو کبھی دوسرے خطۂ ارضی پر۔ ترقی پسند قوتیں ہر دور میں حاوی طاقتیں رہی ہیں۔ انسانی سماجی زندگی کبھی واپسی کے سفر پر گامزن نہیں ہوئی یعنی رجعت پرستی کو قبول نہیں کیا۔ استحصالی طاقتوں اور ظلم و جبر کے ساتھ سوالیہ نشان بنتا گیا۔ ادب میں ترقی پسندی کی تحریک اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

برِصغیر کی ترقی پسند تحریک آغازِ سفر سے بین الاقوامی تحریک کا حصہ رہی ہے۔ ڈاکٹر فاطمی نے زیرِ نظر کتاب میں اِس کا بھی اجمالی جائزہ بڑی جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اِس تحریک کے بنیاد گزاروں نے جن میں سے کچھ کے بارے میں کتابِ مذکورہ میں بڑی خوش اسلوبی سے اظہار کیا گیا ہے، پیرس میں فسطائیت کے خلاف اور تہذیب و ثقافت کے دفاع میں منعقد ہونے والی کانفرنس جس میں دنیا کے چوٹی کے اہلِ قلم شریک ہوئے تھے، سے بالیدگی حاصل کی تھی۔ یہ کانفرنس جولائی 1935ء میں منعقد ہوئی تھی۔ شرکائے کانفرنس نے اِس کانفرنس میں یہ عہد کیا کہ ادیب و شاعر کو اپنے ذاتی نہاں خانوں سے نکل کر انسان کے اجتماعی مفاد اور تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لیے رجعت پسند قوتوں کے مقابل آنا چاہیے اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔

''ترقی پسند تحریک۔ سفر در سفر'' میں یہ بات بڑے واضح الفاظ میں کہی گئی ہے کہ ترقی پسند تحریک میں مختلف مکاتبِ فکر کے لوگ شریکِ سفر تھے جن میں قوم پرست اہلِ فکر و دانش بھی شامل تھے اور تحریکِ آزادی اور جمہوریت کے داعی بھی۔ انجمنِ ترقی پسند مصنفین یقیناً کسی جماعت کا ذیلی ادارہ اور کلچرل ونگ نہیں تھی بلکہ روشن خیالی اور خرد افروزی پر یقین رکھنے والے اہلِ قلم کا وسیع تر محاذ تھی۔ اِس کے باوجود یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہے کہ ترقی پسند تحریک نے انقلاب اکتوبر اور مارکسزم (Marxism) سے بالیدگی حاصل کی تھی کیونکہ دنیا کو تبدیل کرنے کا مذکورہ فلسفہ اُس وقت تک ہمارے لیے معنویت کا حامل رہے گا جب تک انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ہوتا رہے گا۔ دنیا کو عدم مساوات اور استحصال سے پاک دیکھنے کا خواب ہمارے آدرش اور ہماری تخلیقیت کا سرچشمہ رہے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ خواب کلیتہً کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا اور انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال کسی نہ کسی روپ میں جاری رہے گا مگر ہم اپنے اِس خواب کو اپنی حسیت، طرزِ احساس اور تخلیقیت کے جذبے سے جدا نہیں کر سکتے۔ ترقی پسند تحریک اِس خواب کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گی۔

یہ تحریک جو میرے نزدیک سرسید کی علی گڑھ تحریک کی توسیع اور اُس کا ارتقائی تقاضا تھی، چند برسوں میں غیر منقسم ہندوستان کے پورے ادبی افق پر چھا گئی۔ یہ تحریک جو اردو زبان سے شروع ہوئی تھی، اِس کے دائرۂ اثر میں ہندوستان کی تمام اہم زبانیں آ گئیں۔ ادب نئے موضوعات اور امکانات سے روشناس ہوا۔ زندگی، انسان اور سماج جو ادب کے بنیادی موضوعات رہے ہیں، اُن کو دیکھنے برتنے اور سمجھنے کے نئے زاویہ ہائے نظر سامنے آئے۔ تخلیقِ ادب ایک سماجی عمل اور سماجی ذمہ داری ٹھہری اور سماج کو بدلنے کے عمل میں ادب کے کردار کی طرف بھرپور توجہ دی جانے لگی۔

اِس طرح ایک طرف ملک میں نقطۂ عروج پر پہنچنے والی آزادی کی تحریک ادب کا اہم ترین موضوع ٹھہری تو دوسری طرف عالمی آزادی کی تحریک ادب کا اہم ترین موضوع ٹھہری جبکہ تیسری طرف عالمی تناظر میں 'اشتراکی انقلاب' برِصغیر کے بیش تر تخلیق کاروں کا خواب اور آدرش ٹھہرا۔ 1917ء کا انقلاب اکتوبر جس کا استقبال علامہ اقبال نے 'طنینِ گیتی سے پیدا ہونے والا ''آفتابِ تازہ'' کہہ کر کیا تھا، اُس 'آفتابِ تازہ' کی کرنیں بیش تر ترقی پسند تخلیق کاروں کے فکر و احساس کو منور کرنے لگی تھیں۔

ترقی پسند تحریک جو تاریخِ ادبِ اردو کی سب سے بڑی اور ہمہ گیر تحریک قرار پائی ہے، وہ اپنے آغازِ سفر سے ایک بین الاقوامی بلکہ عالمی تحریک کا حصہ تھی اور اِس تحریک کے زیرِ اثر اردو ادب و شعر کو پہلی مرتبہ عالمی ادبی حلقے میں پذیرائی اور recognition حاصل ہوئی۔ ترقی پسند تحریک نے ادب اور سماج کے رشتوں کو نئی معنویت اور نئے مقاصد عطا کیے۔ حُسن کے نئے معیارات قائم ہوئے اور جمالِ فن کی نئی دنیا دریافت ہوئی۔ ہیئت اور مواد کے مابین توازن قائم کرنے کی نئی جہتیں تلاش کی گئیں۔ فرسودہ روایات، فرضی عشق و محبت اور خیالی عاشق و معشوق کے اندھیروں سے اردو شاعری کو نکال کر حقیقتوں کے اجالوں سے روشناس کرایا گیا۔ حُسن و عشق کے حوالے سے حقیقی احساسات اور تجربات کے فنکارانہ اظہار کو تخلیقی ادب کا سرچشمہ قرار دیا گیا۔ غرض یہ کہ ادب کا ایک نیا دور شروع ہوا جسے ادب میں انقلابی دور کا نام دیا جا سکتا ہے۔

باقی صفحہ نمبر 20 پر

امریکہ افغانستان سے نہیں جائے گا

پاکستان کو جمہوری اور ترقی پسند ریاست بنایا جائے

عابد حسن منٹو

طالبان اور القاعدہ امریکہ کو ہی مضبوط کر رہے ہیں، امریکہ آج بھی دنیا بھر میں عالمی سرمایہ داری نظام کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے۔

پاکستان کا سرمایہ بیرون ملک سے واپس لایا جائے، لندن میں احمد نواز وٹو کی زیر صدارت سیمینار سے خطاب، چوہدری فتح محمد، مشتاق لاشاری اور دیگر کی شرکت

ورکرز پارٹی پاکستان کے صدر اور ممتاز ترقی پسند رہنما عابد حسن منٹو نے کہا ہے کہ پاکستان کی موجودہ بدترین حالت کا اصل سبب سابق فوجی ڈکٹیٹر ضیاالحق کا وہ غلط اور غلامانہ فیصلہ ہے جس کے تحت امریکہ کے ایما پر پڑوسی ملک افغانستان میں غیر قانونی مداخلت کی گئی۔ مذہب کے نام پر عام لوگوں کا قتل عام کروایا گیا اور افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان اور پورے جنوبی ایشیاء کا امن بھی تباہ کر دیا گیا۔ وہ پاکستان ورکرز پارٹی یو کے کی لندن برانچ کے زیر اہتمام پاکستان کی سیاسی اور معاشی صورت حال پر ہونے والے سیمینار سے خطاب کر رہے تھے۔

انہوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ نے مذہب اور نام نہاد جہاد کے نام پر اور ڈالروں کے زور پر دو ملکوں کو آگ میں جھونک دیا۔ یہ آگ گزشتہ تیس برس سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ سیمینار کی صدارت لندن برانچ کے کنوینر احمد نواز وٹو نے کی۔ جبکہ نظامت آذر کمال نے کی۔

عابد حسن منٹو نے کہا کہ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ 1977ء سے 1978ء تک ڈیڑھ برس کے عرصے میں جب افغانستان میں نور محمد ترکئی کی قیادت میں انقلاب افغانستان میں آچکا تھا پورے افغانستان میں ایک بھی روسی فوجی موجود نہ تھا۔ لیکن جب امریکہ اور مغربی سرمایہ دار ملکوں نے عرب و اسلامی ملکوں کے جرائم پیشہ اور جیلوں میں بند لوگوں کو رہا کروا کر انہیں مذہب کے نام پر ڈالر اسلحہ، تربیت اور مدد دینا شروع کر دی اور ضیاء الحق نے امریکی سازش کا حصہ بن کر پڑوسی اور مسلم ممالک کے خلاف غیر اعلانیہ جنگ شروع کر دی تو پھر خلق کمیٹی کی درخواست اور افغان حکومت کے ایماء پر روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں کیونکہ امریکہ کے تیار کردہ نام نہاد مجاہدین افغانستان کے عوام کو نشانہ بنا رہے تھے۔

انہوں نے کہا کہ ضیاء الحق اور چند دیگر نام نہاد اسلامی ممالک کے بادشاہوں نے جنوبی ایشیاء میں امریکہ کے اڈے اور ٹھکانے مضبوط کئے اور مذہب کا نام استعمال کر کے پورے خطے، چین، ایران، پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور دیگر ملکوں کی سلامتی اور تحفظ کو خطرے میں ڈال دیا۔ انہوں نے کہا کہ آج طالبان اور القاعدہ، افغان مجاہدین اور جہاد افغانستان کی ہی باقیات ہیں جو اپنی سرگرمیوں سے آج بھی امریکہ کو مضبوط کر رہے ہیں اور امریکی موجودگی کو یقینی اور طویل بنا رہے ہیں۔

امریکہ آج دنیا بھر میں عالمی سرمایہ داری نظام کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ یہ خیال سراسر غلط اور خود فریبی پر مشتمل ہے کہ امریکہ افغانستان سے جا رہا ہے یا جانا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ طالبان اور امریکہ کی نورا کشتی اور جعلی مقابلے امریکہ کے اس موقف کو تقویت بخشتے ہیں کہ امریکہ بہر صورت خطے میں موجود رہے۔ عابد حسن منٹو نے کہا کہ طالبان اور امریکہ دونوں ایک دوسرے کی کمر کھجا رہے ہیں۔

جس دن حقیقتاً امریکہ واپس جائے گا اسی دن طالبان اور القاعدہ بھی ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گے جس طرح امریکہ کا سب سے بڑا نام نہاد دشمن اسامہ بن لادن ایک طلسماتی انداز میں ختم کر دیا گیا۔ انہوں نے سپریم کورٹ آف پاکستان کے اس فیصلے پر تنقید کی جس میں عدالت عظمیٰ نے کہا کہ پاکستان کے کسی بھی کنٹونمنٹ علاقے میں کسی فیکٹری، کمپنی یا ادارے میں سول ملازمین کی ٹریڈ یونین قائم نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے کہا کہ یہ فیصلہ انسانی حقوق اور عالمی قوانین اور ملازمین کے حقوق کے خلاف ہے جس پر بہر صورت نظر ثانی ہونی چاہئے۔

انہوں نے کہا کہ آج پاکستان اپنی تاریخ کے بدترین عہد میں داخل ہو چکا ہے۔ گو ہم قانونی سطح پر دیوالیہ نہیں ہیں لیکن اقتصادی، معاشی اور معاشرتی سطح پر ہمارے حالات دن بدن بد سے بدتر ہو رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کیا ہمارے قومی سیاست دانوں، فوجی جنرلوں، دانشوروں اور بیوروکریسی نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ہمارے ہاں آبادی کا تناسب ہمارے ذرائع سے کئی گنا زیادہ ہو چکا ہے۔ کیا کبھی کوئی ٹیکس نہ دینے کے خلاف دھرنا دیتا ہے، کیا کبھی کوئی مہنگائی، لاقانونیت اور لوٹ مار کے خلاف آواز بلند کرتا ہے؟ کیا کسی میں یہ جرأت ہے کہ وہ فوجی کمرشل اداروں، عسکری بنک، فوجی سوسائٹیوں، فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن یا دیگر اداروں سے ٹیکس لے سکے؟ کیا کسی میں جرأت ہے کہ وہ جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں سے انکم ٹیکس لے؟

انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں سب سے خطرناک اور تشویش ناک بات یہ ہے کہ ہم اندر سے کھوکھلے ہو رہے ہیں جبکہ ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم مضبوط اور طاقتور ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وقت کا تقاضہ ہے کہ ہماری قومی قیادت ایک سیکنڈ بھی ضائع کئے بغیر سر جوڑ کر بیٹھے۔ سرمایہ بیرون ملک سے واپس لایا جائے۔ ٹیکس کا سسٹم سخت ترین بنایا جائے اور فوری طور پر لینڈ ریفارمز کی جائیں۔ تعلیم کو عام کیا جائے اور پاکستان کو ایک جمہوری اور ترقی پسند ریاست بنایا جائے۔ اس موقع پر ایوب اولیاء نے ایک نظم پیش کی جب کہ آخر میں احمد نواز وٹو نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر معروف کسان لیڈر چوہدری فتح محمد، مشتاق لاشاری، راجہ فیض سلطان، ڈاکٹر افتخار احمد، منیب انور، پرویز فتح سولیسٹر راشد اسلم، محسن ذوالفقار، ڈاکٹر توحید احمد، رضوان کیانی اور دیگر بھی موجود تھے۔

لاعلمی دلیل نہیں ہوتی

سعید احمد

سیکولرازم ہر طرف موضوع بحث ہے اخبارات میں مضامین لکھے جارہے ہیں ٹی وی پر مذاکرے اور مباحثے جاری ہیں۔ گفتگو اس وقت تکلیف دہ ہوجاتی ہے جب اس لفظ پر الحاد اور لادینیت کا لیبل لگ جاتا ہے۔ ایک خاص مکتبہ فکر اسی تناظر میں بحث کرتا ہے۔ نئے تناظر کے تعلق سے اشیاء اور الفاظ کے مفہوم مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔ ایسا ہی لفظ ہے آزادی۔

قدیم دور میں آزادی سے مراد مشقتی غلامی سے نجات پانا تھا۔ صنعتی دور آیا تو شاہوں کی رعیتی غلامی سے نجات آزادی ٹھہری۔ صنعتی وسائل کی فراوانی سے جمہوریت کو فروغ ملا تو فیوڈل استبداد سے نجات کو آزادی ٹھہرایا گیا۔ صنعت اور تجارت میں سوداکاری کلچر کو فروغ ہوا تو مارکیٹ کی آزادی کو اصلی آزادی سمجھا جانے لگا۔ آزادی کا پھیلاؤ وسائل اور حقوق کے پھیلاؤ کے ساتھ وابستہ ہے۔ قدامت پرستی کا المیہ یہ ہے کہ الفاظ کے مفہوم صحیح تناظر میں پیش نظر نہیں رہتے۔

سیکولرازم کو پہلی دفعہ 1860ء میں جارج ہولی اوک نے وضع کیا۔ سیکولرازم کا بنیاد ماخذ seculum سے ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''دنیا''۔ قرون وسطیٰ میں رومن کیتھولک پادری دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے ایک پادری جو کلیسائی ضابطوں کے تحت خانقاہوں میں رہتے تھے دوسرے پادری جو عام شہریوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ کلیسا کی اصطلاح میں آخرالذکر کو سیکولر پادری کہا جاتا تھا۔

وہ تمام ادارے سیکولر کہلاتے تھے جو کلیسا کے تحت نہ تھے وہ جائیداد بھی جس کو کلیسا فروخت کردیتا تھا اسی زمرے میں آتی تھی۔

آج سیکولرازم سے مراد سیاست اور نظم ونسق کی مذہب یا کلیسا سے علیحدگی ہے۔ جو سیکولر نظام تعلیم ہے اس میں دینیات کو تعلیم سے الگ کردیا جاتا ہے۔ سیکولر ازم کی وضاحت انسائیکلوپیڈیا امریکانا میں جو کی گئی ہے وہ اس طرح ہے۔ سیکولر ازم ایک ایسا اخلاقی نظام ہے جو قدرتی اخلاق کے اصول پر مبنی ہے اور الہامی مذہب اور مابعد الطبیعات سے جدا ہے۔ اس کا پہلا کلیہ فکر کی آزادی ہے ہر شخص کو اپنے لئے کچھ سوچنے کا حق، تمام فکری علوم کے بارے میں مختلف امور کا حق اور تمام بنیادی مسائل مثلاً خدا اور روح کی لافانیت وغیرہ پر بحث ومباحثے کا حق شامل ہے۔

سائنسی آؤٹ لک کے لئے انسانی قوت فیصلہ کو آزادی دلانے کی ضرورت ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اس وقت تک جنم نہیں لے سکتی جب تک فیصلے کی قوت خودمختار نہ ہو۔ مغرب نے تعلیم سیکولر کرنے کی بنیاد یہ بنائی کہ عقیدہ پرستی میں غلط اور صحیح کے اٹوٹ معیار، ذہن میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور علمی شواہد کو توڑ پھوڑ کر صحیح اور غلط کے ان معیاروں کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔

مادی اور سماجی سائنس کا کام اصول دریافت کرنا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پر حرام اور حلال کے فتوے بے معنی اور غیر موثر ہوتے ہیں۔ عقیدہ پرستی میں اخلاقی اقدار مطلق اور آفاقی ہوتی ہیں۔ جبکہ سائنسی نقطہ نظر میں اخلاقی اقدار میں کوئی ابدیت نہیں۔ ویلیوز جنہیں ہم اقدار کہتے ہیں بذات خود تغیر پذیر تصورات ہیں۔ اقدار کی قیمت افادیت سے وابستہ دیانت اور سچائی کا فیصلہ ویلیوز پر منحصر ہے جبکہ ویلیوز کا فیصلہ سائنس کرتی ہے۔ سائنس ایک سیکولر علم ہے یہ مشاہدے، نظریے اور طریقہ کار میں خالصتاً سیکولر ہے۔ سائنسی افکار تنقید، تنقیص تشکیک اور مادیت کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔

اس لئے عقیدے کو سائنس کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا جائے اور نہ سائنس کو عقیدے کے خلاف جدل کی سطح پر آنے دیا جائے۔ ویسے بھی تنقید کا موضوع بنانے سے عقیدے کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ واقعات کے عمل درعمل دریافت کرنے، عمل اور ردعمل کے انٹرایکشن سے پیدا ہونے والے نئے عمل کے مشاہدات کرنے، تضادات کے بھڑنے اور تحلیل ہونے، واقعات کے درمیان اضافتی اور نسبتی تعلقات کھوجنے میں ارتقاء کے اصول پنہاں ہیں۔

سائنس اور اس کے طریقہ کار میں عقیدے کی ملاوٹ کی جائے تو یہ ٹیکنالوجی کی دریافتوں سے محروم ہوجاتا ہے۔

فطرت بڑی سختی سے اپنے قوانین اور اپنے سیکولر کردار کی حفاظت کرتی ہے۔ فطرت نے قیادت کا فریضہ ان قوتوں کو سونپ رکھا ہے جو فطرت کے سیکولر کردار کی پاسبانی کرتی ہیں۔

سائنس کا علم سیکولر ہے تو یقیناً سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم سے پیدا ہونے والا سماجی نظام بھی سیکولر ہوئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔

سائنس کی ترقی کے اس قدر نتائج برآمد ہوئے ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ انسان کا ذہن قدیم توہمات کے تصرف سے آزاد ہوتا ہے۔ اب وہ مسرت، آسودگی اور نجات کے حصول کے لئے آسمان کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ اس نے اسی کرہ ارض پر ایک منصفانہ معاشرہ قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے جو تمام آلائش سے پاک ہوگا اور جنت کا نمونہ ہوگا۔

بقیہ: ناصر باغ میں ڈیرے ڈلنے کا اعلان

کرگزر جاتے ہیں۔ ہمارے لئے بلوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے بچے بھوکے ہیں جبکہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں نے ہمارے نام پر سوئس اکاؤنٹس بھر لئے ہیں۔ مذہبی جماعتیں امریکی سامراج کے خلاف جعلی نعرے بازی کر رہی ہیں۔ یہ سامراجی قوتوں کی پیداوار ہیں اور اسی سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام میں چلتی ہیں۔ ہمارا نعرہ ہے:

ایک نیا پاکستان۔۔۔۔۔۔

سرمایہ داری، جاگیرداری کے بغیر

ہم 22 اکتوبر کو لاہور سے تحریک کا آغاز کر رہے ہیں۔ ہم ملک بھر کے مختلف شہروں میں اس قسم کے کیمپ لگانے اور ریلیاں نکالنے کی پلاننگ کر رہے ہیں۔ جس سے تحریک کا دائرہ کار ملک بھر میں پھیل جائے۔

پریس کانفرنس سے خطاب کرنے والوں میں عمار علی جان، مشار حمان، نعیم شاکر، فاروق طارق، ممبران سرمایہ داری، جاگیرداری وسامراج مخالف کیمپ کمیٹی تھے۔

روایتی مائنڈ سیٹ کی مظہر APC

رپورٹ: آفتاب احمد شیخ (اسلام آباد)

☆خارجہ پالیسی میں بنیادی جوہری تبدیلی کے بغیر درپیش مسائل کا حل ممکن نہیں۔

☆طاقت ،غلبے اور بالادستی کے تصورات اپنی ''متھالوجی'' سمیت منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

☆''وار آن ٹیرر'' کے تمام فریق اپنا اپنا ''سپیس'' بڑھانے کیلئے ''ریلیف گیم'' کر رہے ہیں۔

☆APC کا اعلامیہ روایتی مائنڈ سیٹ کے زیر اثر محض ''کاسمیٹک ایکسرسائز'' تک رہ گیا۔

☆کوئی واضع پالیسی شفٹ نہیں مقام پالیسی ترجیحات جوں کی توں تھیں۔ہم اس ''سٹیٹس کو'' کا حصہ نہیں بن سکتے۔

☆پارلیمنٹ کے آئینی اختیار کو مستحکم کئے بغیر جمہوریت کے دعوے ایک سنگین مذاق ہیں۔

☆پاکستان اور افغانستان کے تباہ حال عوام امریکہ، ناٹو، طالبان اور انکے پشت بانوں سے نجات چاہتے ہیں۔

☆افغانستان، سامراجی طاقتوں کا مقبوضہ ملک ہے۔ افغان عوام کی حقیقی مزاحمتی تحریک کو ابھرنے نہیں دیا گیا۔

اسلام آباد (عابد حسن منٹو)

بائیں بازو کے راہنما اور ورکرز پارٹی پاکستان کے صدر عابد حسن منٹو نے APC کے پس منظر میں صحافیوں اور پارٹی کارکنوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ APC کا اعلامیہ اپنے متن، سپرٹ اور مقاصد کے حوالے سے اسلئے تشنہ رہا اسے ترتیب دینے والوں کی اکثریت، ماضی کے طرز عمل کے تسلسل اور strategic depth کے مائنڈ سیٹ کی نمائندہ تھی۔ برصغیر کے اس روائتی مائنڈ سیٹ کے برعکس ،ایک حقیقت پسندانہ نقطہ نظر بھی زیر بحث رہا جسے سنا اور سراہا گیا مگر اعلامیے کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ وہ نقطہ نظر مقتدر حلقوں کی خواہشات کے برعکس ،ریاستوں ،ترجیحات اور فیصلوں میں بنیادی تبدیلی کا متقاضی تھا۔ درحقیقت مہربانوں کی APC سے ضرورت اور خواہش جس قدر تھی وہ انہوں نے بخوبی حاصل کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ APC کا اعلامیہ کسی ''بامقصد پالیسی'' کا محرک بننے کے بجائے ایک ''کاسمیٹک ایکسرسائز'' تک محدود رہ گیا۔

مشاورتی اجلاس منعقد کرنے کے باوجود ،پالیسی ترجیحات، فیصلے اور لائحہ عمل بدستور جوں کے توں رہے جو روایتی مائنڈ سیٹ کے تسلسل کا اظہار تھا اور قومی مفادات کے منافی اور تمام مسائل کی بنیاد ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ APC میں مروجہ پالیسی میں ممکنہ تبدیلی کی کوشش کے تدارک کیلئے ،انگوٹھا لگانے کیلئے بیتاب شرکاء کو گنتی میں غالب رکھنے کا پیشگی اہتمام موجود تھا جو اس امر کا غماض تھا کہ بہت کچھ پہلے سے تیار اور طے شدہ تھا۔ تاہم ایسے کسی بھی مقصد اور پیشگی طے شدہ روایتی اعلامیے کا حصہ نہیں بن سکتے تھے۔ چنانچہ پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے میں چھ بجے ہی اجلاس سے چلا گیا کیونکہ اس وقت تک تمام سرکاری بریفنگ بشمول جنرل کیانی کی وضاحت ختم ہو چکی تھی اور نظر آ رہا تھا کہ حکومت APC سے کیا حاصل کرنا چاہتی ہے۔

انہوں نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ ایک منتخب حکومت اور پارلیمنٹ کی موجودگی میں ملک کی خارجہ پالیسی اور اسکی ترجیحات کی تدوین میں عسکری حلقوں کی بالادستی بدستور موجود ہے جنہوں نے گذشتہ ادوار کی strategic depth کی بانجھ پالیسی کو مسلسل ناکامی کے باوجود نسخہ کیمیاء سمجھ رکھا ہے اور اس پالیسی نے ملک کو تنہا، معاشرے کو تباہ اور عوام کو بدحال کر کے رکھ دیا ہے۔ پاکستان دہشت گردی کے جہادی کلچر اور اسکے مجوزہ خارجہ ایجنڈے کا مزید متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس مائنڈ سیٹ نے ہمسایہ ممالک کے ساتھ بھی کئی سنجیدہ سوالات کو جنم دیا ہے۔ بالادستی کی حکمت عملی نے نہ صرف ہمیں دوستوں سے محروم کیا ہے بلکہ بین الاقوامی سطح پر ہمارا سیاسی اور اخلاقی اعتبار بھی مشکوک ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر حکومت APC سے مثبت نتائج حاصل کرنا چاہتی ہے تو بنیادی طور پر واضح، دوٹوک اور غیر مبہم فیصلہ ناگزیر تھا کہ کیا حکومت خود، اور اس کے مسلح ادارے، اور بادشاہ گر ایجنسیاں، جہادی ہسٹیریا اور جہادی عناصر کی سرپرستی سے علیحدگی کا ارادہ رکھتے ہیں یا ابھی بھی ان کے لئے نرم گوشہ رکھتے اور ان کی پشت بانی پر کاربند رہنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے ذریعے strategic depth کی اندھی تلاش جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ طالبان مقامی ہوں یا غیر مقامی، پاکستانی ہوں یا افغانی، درحقیقت القاعدہ کی متشدد تنظیم کی توسیعی شکل ہیں۔ جب کے مجرمانہ عزائم کے نتیجہ میں امن، تہذیب اور انسانی اقدار تباہی و بربادی سے دوچار ہیں۔

انسانی تہذیب کا صدیوں کا حاصل ایک ایسے خطرے کی زد میں ہے جس کے تدارک کے لئے تمام مہذب اور سیکولر و جمہوری مزاج رکھنے والے عناصر کو منظم ہونا ہوگا۔ یہ محض اسلحہ اور طاقت کی لڑائی نہیں بلکہ یہ بالادستی اور جارحیت و غلبے کے مجنونانہ مائنڈ سیٹ کی توسیع اور اس کا منطقی نتیجہ ہیں۔ جس کا مقابلہ مہذب اور جمہوری قوتیں، امن، صلح کل، بھائی چارے، افہام و تفہیم اور انصاف کی اقدار سے کر سکتی ہیں۔

مروجہ مائنڈ سیٹ اس صورت حال سے عہدہ برآء ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا اور APC نے صاف ظاہر کر دیا ہے کہ مقتدر حلقے ایسا کرنے نہیں جا رہے۔ لگتا ہے ان کا ایڈونچر جاری رہے گا۔ تاہم اس کے باوجود دہشت گردی اور جہادی کلچر سے نجات کے لئے، معاشرے کو پرامن اور ملک کے محفوظ رکھنے کے لئے، اس مرحلہ پر تمام ترقی پسند، جمہوری عناصر اور سول سوسائٹی کو ایک وسیع تر تحریک کی صورت میں منظم ہونا ہوگا۔ تاکہ ملک، معاشرہ اور عوام کا مستقبل محفوظ بنایا جا سکے۔

انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کے عوام کو پورے سچ سے آگاہ کیا

جائے۔ پاکستان کی آزادی وخودمختاری، اس کی داخلہ وخارجہ پالیسی، اس کا معاشی اور اقتصادی پروگرام اور خود فوج کے کردار کے بارے میں ایک غیر مبہم پالیسی از سرنو ترتیب دی جائے۔ ملکی سیاست اور داخلہ وخارجہ پالیسیوں سمیت معیشت میں بھی اس کی مداخلت اور اجارہ دارانہ حیثیت کو ختم کر کے پارلیمنٹ کے جمہوری اختیار کو مستحکم کیا جائے۔ اور فوج کو اسی کردار تک محدود رکھا جائے جو دنیا کے مہذب ممالک میں اسے سونپا جاتا ہے۔ یعنی فقط پیشہ ورانہ دفاعی فرائض اور پارلیمنٹ کے احکامات کی بجا آوری۔

انہوں نے کہا کہ یقیناً آپ جانتے ہونگے کہ دنیا میں کہیں بھی افواج کارپوریٹ انٹریسٹ قائم نہیں کرتیں، پرائیویٹ انٹر پرائزز نہیں چلاتیں، معیشت، تجارت اور سروسز میں اپنی اجارہ داریاں قائم نہیں کرتیں، ٹیکس سے مستثنیٰ کاروبار کھڑے نہیں کرتیں اور وسیع زرعی رقبوں پر قابض ہو کر عملاً جاگیرداری کو مستحکم نہیں کرتیں۔ مگر ہمارے ہاں ابھی تک الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ اور صورتحال یہ ہے کہ منتخب پارلیمنٹ اپنے ماتحت عسکری اداروں سے سوال بھی نہیں کر سکتی، حساب نہیں مانگ سکتی، جواب طلبی اور محاسبہ کے لئے کمیشن نہیں بٹھا سکتی۔

یہ تمام صورت حال جمہوری تصورات کے منافی اور آئین کی بالادستی سے متصادم ہے۔ اس لئے عسکری اداروں کو ان کی حدود تک محدود رکھنا ہوگا۔ اور اس کے لئے ناگزیر ہے کہ ایک میجر پالیسی شفٹ، انتظامی سطح پر بھی اور پالیسی سازی میں بھی بروئے کار لایا جائے۔

انہوں نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ ملک اور معاشرے کا دفاع ایٹم بم سے نہیں بلکہ معاشی ترقی اور پر امن بقائے باہمی کے حقیقت پسندانہ اصول پر مبنی خارجہ پالیسی سے ہوگا۔ طاقت، بالادستی، جنگ اور مخاصمت کے تصورات، سرد جنگ کے زمانہ کے ساتھ ہی تاریخ کے کباڑ خانے میں دفن ہو چکے ہیں۔ دنیا گفت وشنید اور افہام وتفہیم کے ذرائع کو مشکلات کے باوجود ترجیح دے رہی ہے۔ علاقائی امن کے لئے اچھی ہمسائیگی بنیادی شرط ہے جس کی پاسداری تمام ممالک کے لئے لازم ہے اور ملک، معاشرے اور مستقبل کے لئے امن، ترقی، خوشحالی اور تحفظ کی بنیاد فراہم کرے گی۔ اس لئے فیصلہ سازی کے مراکز کو 'سرد جنگ' کی روائتی myth سے نکال کر حقیقت پسندی کی بنیاد پر استوار کرنا ہوگا۔

انہوں نے افغان مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ افغان عوام کے مصائب اور اس خطے کے مسائل کا آغاز اولاً 1978ء کے اواخر میں امریکہ اور سعودی حمایت سے ضیاء آمریت کے دور میں نام نہاد 'جہاد' سے شروع ہوا اور دوبارہ امریکی مداخلت اور امریکی سنٹرل کمانڈ کے جھنڈے تلے NATO افواج کے افغانستان پر حملے اور قبضے سے شروع ہوا۔

بدامنی، جہاد کے نام پر دہشت گردی، بیرونی مداخلت اور غیر یقینی صورت حال تو دو عشرے پہلے سے موجود تھی۔ مگر افغانستان میں کھلی اور ننگی جارحیت 9/11 کے واقعہ کے بعد شروع ہوئی۔ نتیجۃً آج افغانستان سامراجی طاقتوں کا مقبوضہ ملک ہے۔ آج کے دہشت گرد جنگجو گزشتہ کل کے امریکی ہیروز اور سامراجی حکمت عملی کا اثاثہ کہلاتے تھے۔

انہوں نے کہا کہ افغانستان ایک پسماندہ معیشت اور معاشرت رکھنے والا ملک تھا جس نے اپریل 1978ء میں انقلاب ثور کے ذریعہ صدیوں کی پسماندگی سے نکلنے کی اجتماعی کوشش کی جسے عالمی سامراجی یلغار نے کامیابی سے ہمکنار نہیں ہونے دیا۔ دنیا بھر سے دہشت گردوں کو یہاں لا جمع کیا۔ انہیں مسلح کیا، وسائل مہیا کئے اور انقلاب دشمنی کا ایک وسیع محاذ قائم کیا۔ بعد ازاں حکمت عملی اور مقاصد کی تبدیلی نے سامراجی ترجیحات کا رخ تبدیل کیا تو یہی مسلح جتھے القاعدہ، طالبان، مجاہدین، لشکر اور سپاہ کی شناخت کے ساتھ کبھی علیحدہ اور کبھی مشترکہ مہم جوئی پر اتر آئے۔

اس کے ساتھ ساتھ عشروں پر پھیلی جنگ اور انارکی کے دوران مقامی، علاقائی اور عالمی سطح پر اس صورتحال کے ساتھ بیشمار انٹرسٹ وابستہ ہو گئے جس نے صورت حال کو مزید پیچیدہ بنانے میں ایک بڑے فیکٹر کا کردار ادا کیا۔ افغانستان پر قبضہ اور دسترس کی کشمکش کے دوران جہادی عناصر میں داخلی تضادات، نسلی، لسانی و علاقائی اور مسلکی تعصّبات کی صورت میں ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ اور اسی داخلی پیکار کے دوران علاقائی طاقتوں نے بھی اپنے اپنے گھوڑے تیار کرنے اور اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کا راستہ اختیار کر لیا۔ نتیجۃً آج افغانستان اور پاکستان بدترین انتشار اور انارکی کا شکار ہیں۔

انہوں نے کہا کہ یقیناً افغانستان ایک پسماندہ ملک تھا مگر یہ دہشت گردوں کا ملک نہیں تھا کہ امریکہ اپنے لاؤ لشکر سمیت اس بدقسمت ملک پر ٹوٹ پڑا۔ اور اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ 9/11 کے مبینہ واقعات میں کیا کوئی افغانی باشندہ ملوث تھا یقیناً نہیں۔ اگر 9/11 میں القاعدہ ملوث تھی تو دنیا بخوبی جانتی ہے کہ القاعدہ امریکہ کی پروردہ تنظیم تھی۔ جس نے تعاون اور ردعمل دونوں ادوار میں امریکی مقاصد اور مفادات ہی کو آگے بڑھایا۔ اور اس کے سامراجی عزائم کو عملی شکل دینے کے لئے جواز فراہم کیا۔

انہوں نے کہا کہ اس خطے میں امریکی سامراجی مقاصد طویل المیعاد حکمت عملی پر محیط ہیں۔ جبکہ علاقائی طاقتوں کے انٹرسٹ بھی کہیں سامراجی حکمت عملی سے وابستگی اور کہیں انفرادی راستہ بنانے کی کوششوں سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ سامراجی طاقتوں کے مابین بھی مفادات کی داخلی کشمکش موجود ہے اور علاقائی طاقتیں بھی اپنا اپنا مفاد بڑھانے کی تگ ودو میں ہیں۔ یہ کشمکش ختم ہونے والی نہیں اور اس کشمکش کا نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے عوام، بدامنی، بدحالی، دہشت گردی، بے یقینی اور عدم تحفظ کے ایسے گرداب میں پھنس چکے ہیں جس سے نجات ''سٹیٹس کو'' کی روایتی قوتوں کے بس کا روگ نہیں۔

امریکی سامراج کی اس پورے خطے کے وسائل پر کامل دسترس اور پورے خطے کو صارفین کی منڈی کی مستقل حیثیت دینے کی اندھی خواہش ایک بے لگام قوت کے طور پر برسرعمل ہے۔ دہشت گردوں کی کبھی بلاواسطہ اور کبھی بالواسطہ سرپرستی اس کی حکمت عملی کا ایک پہلو ہے۔ انارکی، انتشار، بے یقینی اور عدم تحفظ کی فضا اس کے سامراجی منصوبوں کے لئے سازگار ماحول فراہم کرتی ہے۔ اور وہ اس خطے میں جدید زندگی کی بنیادوں کو محدود اور خوشحالی کے احکامات کو معدوم کرنا چاہتا ہے

باقی صفحہ نمبر 16 پر

سرمایہ داری، جاگیرداری سامراج مخالف کیمپ کا ناصر باغ میں ڈیرے ڈالنے کا اعلان

نعیم شاکر اور فاروق طارق کا پریس کانفرنس سے خطاب

بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی مختلف سیاسی جماعتوں، ٹریڈ یونینوں اور سماجی تنظیموں نے فیصلہ کیا ہے کہ 22 اکتوبر کو 12 بجے دن سے ناصر باغ لاہور میں سرمایہ داری، جاگیرداری اور سامراج مخالف کیمپ لگایا جائے گا۔ یہ سرمایہ داری مخالف کیمپ عالمی سطح پر سرمایہ داری نظام کے خلاف چلنے والی تحریک سے یک جہتی اور پاکستان میں جاری نظام کی مکمل ناکامی کے خلاف تحریک شروع کرنے کے لئے لگایا جارہا ہے۔

ہم دنیا بھر میں چلنے والی سامراج مخالف تحریک کے شرکاء سے اظہار یکجہتی کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ پاکستان ان سے پیچھے نہیں ہے۔ پاکستان میں سرمایہ داری و جاگیرداری نظام مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ اس نظام کو آصف زرداری چلائے یا میاں نواز شریف یہ کسی بھی صورت محنت کش عوام کی نجات کا باعث نہیں بن سکتا۔ آج پاکستان میں سرمایہ داری نظام کی ترجیحات مکمل طور پر عوام کے خلاف ہیں۔ قومی بجٹ کا صرف دو فیصد تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ ایک فیصد صحت پر خرچ کیا جاتا ہے جبکہ فوج پر بجٹ کا 20 فیصد ضائع کیا جاتا ہے اور غیر ملکی قرضہ جات کی واپسی میں بجٹ کا 35 فیصد حصہ لگا دیا جاتا ہے، یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف عالمگیر احتجاج کی حمایت میں سرگرم کارکنان ناصر باغ میں دھرنا کیمپ قائم کر رہے ہیں کیونکہ پاکستان کے بڑے امیر سیاست دان، جاگیردار، آرمی جرنیل، بڑے صنعت کار، بیوروکریٹس تمام کے تمام بین الاقوامی اشرافیہ کے مفاد میں کام کرتے ہیں۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کی وجہ سے غربت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ آبادی کا 50 فیصد حصہ غربت کی لائن کے نیچے زندگی بسر کر رہا ہے۔

لاہور کی ترقی پسند اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی سیاسی اور سماجی قوتیں وال اسٹریٹ کے مظاہرین سے اظہار یکجہتی اور سرمایہ داری نظام کے موجودہ بحران کے خلاف نفرت اور غصہ کے اظہار کے لئے 22 اکتوبر بروز ہفتہ ناصر باغ میں دوپہر 12 بجے سرمایہ داری، جاگیرداری سامراج مخالف کیمپ منعقد کرنے جارہی ہیں۔

یہ حقیقت آج پوری دنیا پر عیاں ہو چکی ہے کہ سرمایہ داری نظام دنیا کی اکثریتی آبادی کی خوشحالی اور باعزت زندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دنیا بھر میں ہونے والے سرمایہ داری مخالف مظاہروں نے اس نظام کے چلانے والے حکمرانوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بس بہت ہو چکا اب عام لوگوں کی زندگی کو اجیرن بنانے کے عمل کو مزید برداشت نہیں کیا جائے گا۔

یہ مظاہرے اس بات کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ دنیا بھر کے محنت کش سرمایہ داری نظام کی سیاست کو چلانے والے پوشیدہ ہاتھوں سے اپنی سیاست پر ناجائز قبضہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور محنت کشوں کی سیاسی تحریکوں کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ اس موجودہ تحریک میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے سرمایہ داری نظام کو برائی کی جڑ قرار دیا ہے اور اس کے متبادل نظام کی بات کی ہے۔ موجودہ نظام نے چند مٹھی بھر امیروں کو تو امیر تر بنا دیا ہے لیکن دنیا کے 99 فیصد لوگوں کو غربت کی بھٹی میں جھونک دیا ہے۔

ہم لاہور کے ترقی پسند حلقے دنیا بھر میں ابھرنے والی سرمایہ داری مخالف لہر کا حصہ بن رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں مقامی مسائل کی نوعیت قدرے مختلف بھی ہے جن کو ہم اس تحریک کا حصہ بنتے ہوئے اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں سرمایہ داری نظام انتہائی برے طریقے سے ناکام ہو چکا ہے اور اس کی نہایت ظالمانہ شکل سامنے آرہی ہے۔

بھوک، بیروزگاری، لوڈ شیڈنگ، زمین کی غیر منصفانہ تقسیم، مہنگائی، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی آمرانہ پالیسیاں، فوج کی حکمرانی، مذہبی بنیاد پرستی اور امریکی سامراجی حملے پاکستان کے سرمایہ داری نظام کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل میں سے چند ایک ہیں۔ سرمائے کی بین الاقوامی قوت جو کہ ہماری زندگیوں پر قبضہ کئے ہوئے ہے کے خلاف بین الاقوامی جدوجہد کا ہمیں حصہ بننا ہے اور دنیا بھر کے محنت کشوں کے لئے ایک نئے نظام کے اجراء کی کوشش کرنی چاہئے۔

200 سال سے زائد عرصہ سے ہمارے خطے کو سرمایہ داری نظام نے اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے جس کے نتیجے میں کروڑوں کسانوں، محنت کشوں اور طلباء کی زندگی کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ اب یہ محنت کش قوتیں اس جبر کے نظام کے خلاف اکٹھی ہو رہی ہیں۔ ناصر باغ میں سرمایہ داری مخالف کیمپ کا قیام اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ ہم ترقی پسند قوتوں کو اس کیمپ میں شمولیت کی دعوت دیتے ہیں تا کہ وہ یہاں شامل ہو کر اپنے اپنے مسائل پر بات کر سکیں۔

ہماری کوشش ہے کہ ناصر باغ کا کیمپ، لاہور کی ترقی پسند قوتوں، ٹریڈ یونینز، خواتین، نوجوانوں کی تنظیموں اور پاکستان کے بائیں بازو کے لئے حقوق کی جدوجہد کا میلہ بن جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام کا خاتمہ کوئی آسان کام نہیں ہے اور اس کے لئے طویل جدوجہد کی ضرورت ہے لیکن اس جدوجہد کے لئے ہمیں قدم اٹھانا ہونگے ورنہ ہم اس نظام کے اندر بے بسی کی موت مر جائیں گے۔

یہ کیمپ ہمیں عام لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے اور ان میں سرمایہ داری کے متبادل نظام پر بات کرنے کا موقع فراہم کرے گا۔ یہ سرمایہ داری سے چھٹکارا پانے کے لئے بڑی جدوجہد میں پہلا قدم ہوگا۔ پاکستان کے عوام ایک عرصہ سے خاموش تھے جبکہ لینڈ کروزر والے ہمارے چہروں پر دھول اڑا

باقی صفحہ نمبر 12 پر

لاہور میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام مخالف کیمپ و ریلی

22 اکتوبر 2011ء کو لاہور میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام مخالف کیمپ کا آغاز ہوا جس میں بائیں بازو کی مختلف جماعتوں، سماجی تنظیموں، ٹریڈ یونین و بھٹہ مزدور تنظیموں، صحافی، خواتین اور طلبہ تنظیموں اور وکلاء دانشوروں نے شرکت کی۔

لاہور کے ناصر باغ میں سرمایہ دارانہ نظام مخالف کیمپ کا انعقاد دنیا بھر میں پھیلی سرمایہ داری نظام کے خلاف نفرت اور ظلم و استحصال کے خلاف تحریک جو امریکہ کے شہر نیویارک میں 'وال سٹریٹ پر قبضہ کرو' 'Occupy the Wall Street' کے نام سے شروع ہوئی کے ساتھ یکجہتی کا اظہار بھی تھا۔ اور اس ظالمانہ نظام کے پروردہ حکمرانوں سے ملک پاکستان کو آزاد کرانے اور عام آدمی کو کاروبار مملکت میں شراکت دار بنانے کا عزم بھی تھا۔

یہ تحریک وال سٹریٹ سے چلتی چلتی دنیا کے نوے سے زائد ملکوں میں جا پہنچی ہے اور دنیا کے تمام براعظموں کے بڑے شہروں میں احتجاجی مظاہرے ہو رہے ہیں اور لوگ امن و انصاف کے قیام کے لئے بیداری کی نئی لہر کا ساتھ دے رہے ہیں۔ عابد حسن منٹو کی قیادت میں نعیم شاکر، صفدر سندھو، غلام دستگیر محبوب، بشیر ظفر، الطاف بلوچ، محمد اکبر، ممتاز جوئیہ، نصیر ہمایوں، نصرت بشیر ظفر، غلام مجتبیٰ، راجہ ولایت، مقصود خوشی، جہانگیر سندھو، محمد عاشق، محمود جدران سمیت ڈیڑھ سو ساتھیوں نے ورکرز پارٹی پاکستان کی نمائندگی کی۔

ناصر باغ میں لگے احتجاجی کیمپ کو سرخ پرچموں اور مزدوروں کسانوں، بھٹہ مزدوروں، خواتین و طلبہ اور نوجوانوں کے مطالبات پر مبنی بینروں سے سجایا گیا تھا۔ اس کیمپ کی ترتیب و تشکیل میں شہر کے نوجوان طلبہ نے خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شمولیت کی تھی۔ اس احتجاجی کیمپ کے سلسلہ میں ہونے والے اجلاسوں میں نوجوان برابر کے شریک تھے۔ کیمپ میں تعلیمی اور انقلابی لٹریچر کی تقسیم کے لئے سٹال بھی لگائے گئے تھے۔

کیمپ سے ورکرز پارٹی پاکستان کے صدر عابد حسن منٹو، میاں محمد رفیق ایم پی اے لیبر پارٹی پاکستان کے رہنماء فاروق طارق، پاکستان ورکرز فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری خورشید احمد، پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری صفدر حسین سندھو، نیشنل ٹریڈ یونین فیڈریشن کے چیئرمین یوسف بلوچ، نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری عرفان چوہدری، پروگریسو یوتھ فرنٹ کے رہنماء عمار جان، پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹ کے سینئر وائس پریذیڈنٹ ارشد یاسین، پنجاب یونین آف جرنلسٹس کے رہنماء حافظ عبدالودود، ویمن ورکرز ہلپ لائن کی رہنماء عذرا شاد، کسان مزدوروں کی رہنماء جمیلہ بیگم نے خطاب کیا۔ اس موقع پر مزدور کسان پارٹی کے رہنماء تیمور رحمٰن کے 'لال بینڈ' نے انقلابی گیت پیش کئے۔

مقررین نے کہا کہ ملک کے کرپٹ اور اس سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے پروردہ حکمرانوں سے نجات کا صرف ایک راستہ ہے کہ ملک کے محنت کشوں کو سیاسی طور پر منظم کیا جائے کیونکہ سماجی تبدیلی کے لئے ان کی سیاسی قوت ملک کے سماجی اور اقتصادی نظام کو تبدیل کرنے میں انقلابی کردار ادا کرے گی۔

مقررین نے کمر توڑ مہنگائی اور آئے دن گیس بجلی و پٹرول کے نرخوں میں اضافہ کی شدید مذمت کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پابندیاں ختم کی جائیں اور کسانوں کو بیج، کھاد اور کرم کش دوائیں سستے داموں فراہم کی جائیں۔ مزدوروں بشمول بھٹہ مزدوروں کو حکومت کے اعلان کے مطابق کم سے کم اجرت 7 ہزار روپے ادا کرنے کے لئے موثر اور عملی انتظامات کئے جائیں۔ خواتین اور اقلیتوں کے خلاف امتیازی قوانین ختم کئے جائیں۔ طلبہ کو تعلیم اور تفریحی سہولتیں فراہم کی جائیں اور نوجوانوں کے لئے روزگار کی ضمانت فراہم کی جائے۔

احتجاجی کیمپ کے اس اجلاس کے بعد ریلی نکالی گئی جو مال روڈ اور انارکلی سے ہوتی ہوئی واپس کیمپ میں پہنچی اس کے بعد کیمپ میں نوجوان دوستوں نے سٹڈی سرکل کا اہتمام کیا جس میں سماجی تبدیلی لانے کے موضوعات پر مکالمہ عمل میں لایا گیا۔

بقیہ: APC

جو ہمیں اور ہمارے ملک کے عوام کو کسی قیمت قبول نہیں ہوگا۔

بین الملکی سطح پر اس کے تدارک کا واحد قابلِ عمل راستہ ریجنل کوآپریشن کے فورم کی بامقصد فعالیت میں مضمر ہے۔ خطے کے ممالک کو ذمہ دارانہ کردار ادا کرتے ہوئے سامراجی افواج کے فوری انخلاء کا مطالبہ کرنا ہوگا۔ اور ایک ناگزیر طریقے کے طور پر افغان عوام کو بحالی کے لئے مدد دینا ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ داخلی سطح پر ہمیں بھی جوابدہی اور خود احتسابی کے عمل کو اپنانا ہوگا۔ سماجی امن و سکون، معیشت کی بحالی، عوام کی خوشحالی اور ملکی سلامتی کے لئے زنگ خوردہ مائنڈ سیٹ سے نکل کر حقیقت پسندی کو راہِ عمل بنانا ہوگا۔ ہمسایہ ممالک سے اتفاق رائے کو وسیع کرنا ہوگا۔ سامراجی شکنجے سے نکلنے کے لئے علاقائی تعاون برائے ترقی کے فورم کو سرگرمی سے بروئے کار لانا ہوگا۔

اس کے بعد اس خطے میں، بالخصوص افغانستان و پاکستان میں بہتری اور خوشحالی کے امکانات ناممکن نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس ضمن میں بائیں بازو کے جمہوری عناصر کی بھی تاریخی ذمہ داری ہے کہ سامراجی ریشہ دوانیوں، مقامی جنگجویانہ مہم جوئی کی حکمت عملی، اور خطے میں سامراجی ممالک کی افواج کی موجودگی کے خلاف ایک وسیع تحریک کو منظم کرنے کی جدوجہد کو آگے بڑھائیں۔ تمام ترقی پسند قوتیں ایک کم از کم مشترک ایجنڈے پر متفق اور منظم ہو کر مشترکہ پیش قدمی کا راستہ اختیار کریں۔ عوام کی وسیع جمہوری تحریک اس خطے کی صورت حال میں بہتری کی ضمانت بن سکتی ہے اور کوئی بھی APC عوام کی رہنمائی کے شعوری فیصلے کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔

ریگل چوک تا کراچی پریس کلب "سرمایہ داری مخالف محاذ" کی جانب سے سرمایہ داری کے خلاف احتجاجی ریلی

بائیں بازو اور قوم پرست جماعتوں پر مشتمل ''سندھ پروگریسو کمیٹی'' کی جانب سے بلائے گئے اجلاس میں 34 سے زائد ٹریڈ یونین، طلبہ، نوجوان، خواتین اور چھوٹے دکانداروں کی تنظیموں کی جانب سے مشترکہ طور پر قائم کئے جانے والے ''سرمایہ دار مخالف محاذ'' (Anti Capitalist Front) کے زیر اہتمام دنیا بھر میں سرمایہ داری کے خلاف جاری تحریک سے اظہار یکجہتی کرنے کے لئے شام 4 بجے ریگل چوک صدر سے ایک عظیم الشان ریلی نکالی گئی جو کراچی پریس کلب پر اختتام پذیر ہوئی۔

ریلی میں سینکڑوں کی تعداد میں محنت کشوں، طلباء، خواتین اور سیاسی کارکنوں نے شرکت کی جو اس موقع پر سرمایہ داری کے خلاف زبردست نعرے بازی کر رہے تھے اور انہوں نے سرمایہ داری مخالف نعروں پر مشتمل بینرز اور پلے کارڈ اٹھا رکھے تھے۔

اس موقع پر ریلی سے خطاب کرتے ہوئے رہنماؤں نے کہا کہ آج بین الاقوامی طور پر سرمایہ دارانہ نظام سخت بحران کا شکار ہے خاص کر ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک جن کا سرخیل امریکہ ہے اور یورپی ممالک اربوں کھربوں ڈالر کے مقروض ہیں اور وہاں کے لاکھوں لوگ بیروزگاری و مہنگائی کا شکار ہیں۔ عام آدمی کے لئے سرکاری سطح پر تعلیم اور صحت و علاج معالجے کی سہولتیں کم سے کم بلکہ ناپید اور زندگی اجیرن ہوتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال کے خلاف امریکہ کی وال سٹریٹ سے شروع ہونے والی احتجاجی تحریک امریکہ اور یورپ کے مختلف شہروں میں پھیل گئی ہے اور لاکھوں لوگ سراپا احتجاج ہیں۔

ہم اس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اٹھنے والی بین الاقوامی تحریک کے ساتھ یکجہتی اور عملی جدوجہد کا اعلان کرتے ہیں۔ پاکستان اور اس جیسے دیگر پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک ترقی یافتہ بین الاقوامی سرمایہ داری، گلوبلائزیشن اور اس کے مالیاتی و تجارتی اداروں، ورلڈ بنک، ایشین ترقیاتی بینک، آئی ایم ایف، ڈبلیو ٹی او اور اس کی نو سامراجی شکلوں کے بدترین استحصال کا شکار ہیں۔

پاکستان کے مزدور، کسان، نچلے و درمیانہ طبقے، دانشور، چھوٹے تاجر و دکاندار اور تمام محنت کار عوام ایک طرف تو جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے جبر کا شکار ہیں جبکہ دوسری طرف بین الاقوامی سرمایہ داری و گلوبلائزیشن کی پالیسیوں کی وجہ سے تمام صنعتی و معاشی ترقی رُک کر رہ گئی ہے۔

عوامی حیثیت کے تمام ادارے جن میں ریلوے، پی آئی اے، اسٹیل ملز، مشین ٹولز فیکٹری، بجلی و پانی کے محکمے حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کی بناء پر تباہ حالی کا شکار ہیں۔ لاکھوں محنت کشوں کو جبری طور پر برطرف کر دیا گیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ لاکھوں انسان برسات اور سیلاب کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں کھلے آسمان تلے پڑے غیر انسانی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں جبکہ سامراج کے حواری بددیانت حکمران چین کی بانسری بجا رہے ہیں اور عوام اپنی زندگی کی بنیادی سہولتوں اور حقوق سے محروم ہیں۔

یہ ہولناک حقیقت اب روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے کہ اس سیم وزر کے نظام نے ساری دنیا کو جنگوں، غربت و افلاس، بیماری اور بیروزگاری میں مبتلا کر رکھا ہے اور اس سے نجات کا واحد راستہ اس لوٹ کھسوٹ پر مبنی سرمایہ دارانہ معاشی و سماجی نظام میں انقلابی تبدیلیوں ہی سے ممکن ہے۔ اس انقلابی تبدیلی کے لئے محنت کش عوام کی بین الاقوامی تحریک جنم لے چکی ہے اور اسی تحریک کے حصے کے طور پر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے مزدوروں، کسانوں، چھوٹے تاجروں، خواتین، طلباء اور سماج کے پسے ہوئے طبقات کی جانب سے جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے۔

دریں اثناء رہنماؤں نے مطالبہ کیا ہے کہ ☆ پاکستان میں جاگیرداری ختم کی جائے ☆ IMF، ورلڈ بینک سمیت سامراجی مالیاتی اداروں کی سرمایہ داری پر مبنی پالیسیوں کو ختم کیا جائے ☆ برسات اور سیلاب سے متاثرہ لاکھوں لوگوں کی بحالی کے لئے فی الفور اقدامات کئے جائیں ☆ نجکاری، ڈاؤن سائزنگ اور جبری برطرفیوں سمیت تمام مزدور دشمن اقدامات فوری طور پر ختم کئے جائیں ☆ پرائیویٹ کئے گئے تمام اداروں کو قومی تحویل میں لیا جائے۔

ریلی سے خطاب کرنے والوں میں ورکرز پارٹی (اختر حسین ایڈووکیٹ، یوسف مستی خان) کمیونسٹ پارٹی (کامریڈ اقبال) لیبر پارٹی (ناصر منصور) عوامی پارٹی (حسن ناصر) نیشنل پارٹی (جان محمد بلیدی) جئے سندھ محاذ (عبدالخالق جونیجو) وطن دوست انقلابی پارٹی (دوست محمد چنا) اور نیشنل ٹریڈ یونین فیڈریشن (رفیق بلوچ، غنی زمان اعوان) کے علاوہ کنیز فاطمہ، فرید اعوان، منظور رضی، شرافت علی، بی ایم کٹی، منظور ملاح، فہیم زمان، سید شمس الدین، نور محمد، صالحہ آپا اور سجاد ظہیر نے بھی خطاب کیا۔

☆☆☆☆☆

ضلع فیصل آباد میں پارٹی سرگرمیاں

عرفان چوہدری

فیصل آباد میں ڈسٹرکٹ کمیٹی کے اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہو رہے ہیں اور نئے رابطے اور ممبرشپ کا کام بھی جاری ہے۔ جنوری 2011ء کے پہلے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ فیصل آباد کی سطح پر ممبرشپ کو دوگنا کیا جائے اور یہ کام اس سال کے اختتام تک مکمل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ پارٹی کارکن ٹیکسٹائل سیکٹر کے مزدوروں اور بھٹہ خشت کے مزدوروں میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں اور محنت کشوں کو ٹریڈ یونینز میں منظم کرنے، مزدور حقوق کی جدوجہد کو تیز کرنے اور انہیں پارٹی پروگرام اور محنت کش طبقے کی سیاست کے ساتھ جوڑنے کا کام تسلسل کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پارٹی کے ذمہ داران مختلف مزدور تنظیموں اور ٹریڈ یونینز کے عہدیدار ہیں۔ عاشق حسین چوہدری ریلوے ورکرز یونین اوپن لائن کے صدر ہیں، ارشد عزیز ورکرز اینڈ سٹاف یونین رفحان ملز کے جنرل سیکرٹری ہیں اور ڈسٹرکٹ پارٹی کے امور محنت کے سیکرٹری بھی ہیں۔ محمد یاسین انقلابی پاور لومز ورکرز یونین کے صدر ہیں۔ اصغر شاہین فریڈم بھٹہ ورکرز یونین کے صدر ہیں۔ اس کے علاوہ پارٹی ساتھی لیبر قومی موومنٹ اور پاکستان مزدور موومنٹ کے ساتھ اشتراک عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزدور تحریک میں ہراول دستہ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

ورکرز پارٹی کی سرگرمیاں

مورخہ 11 ستمبر 2011ء کو فیصل آباد میں 60 ج ب عیسیٰ نگری میں بھٹہ مزدوروں کا ایک اجتماع منعقد ہوا جس میں سینکڑوں بھٹہ مزدور، محنت کشوں نے شرکت کی۔ جلسہ میں ورکرز پارٹی فیصل آباد کے جنرل سیکرٹری عارف ایاز، ساجد اقبال صفدر، یاسین انقلابی، نسیم انتھونی اور عرفان چوہدری نے شرکت کی۔ اجلاس میں بھٹہ مزدوروں کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے مقررین نے محنت کش طبقے کے اتحاد پر زور دیا اور مطالبہ کیا کہ حکومت وقت اپنے کئے گئے فیصلوں پر عمل درآمد کرے اور بھٹہ مزدوروں کے مقرر معاوضہ جات پر عمل درآمد کو یقینی بنائے۔ بھٹہ مالکان حکومتی ریٹ پر عمل درآمد نہ کر کے دراصل حکومتی رٹ کو چیلنج کر رہے ہیں لیکن اس حکومتی رٹ کی مخالفت پر انتظامیہ خاموش رہتی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ ریاستی مشینری انہی طبقات کی نمائندہ ہے۔

25 ستمبر کو ورکرز پارٹی پاکستان اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے ساتھیوں نے پاور لوم ورکرز کے ایک اجتماع میں شرکت کی اس جلسہ کی صدارت محمد یاسین انقلابی نے کی جو کہ ورکرز پارٹی پاکستان کے ممبر بھی ہیں۔ اجلاس میں پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے مرکزی جنرل سیکرٹری صفدر حسین سندھو نے بھی شرکت کی اور محنت کشوں کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔

30 ستمبر کو فیصل آباد میں ورکرز پارٹی فیصل آباد مدینہ ٹاؤن کے انتخاب کے لئے مدینہ ٹاؤن کے ممبران کا ایک اجلاس چک نمبر RB/209 میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں مدینہ ٹاؤن کا انتخاب عمل میں آیا جس میں ورکرز پارٹی مدینہ ٹاؤن کے لئے کامریڈ ظہیر حسین صدر اور کامریڈ زاہد حسین جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اجلاس کے بعد لائلپور کے انقلابی اور برصغیر کے عظیم رہنماء بھگت سنگھ کی یاد میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ان کی جدوجہد کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک سٹیج ڈرامہ (نانک) کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نانک کے لئے خصوصی طور پر لاہور سے سنگت لاہور کے ساتھی فیصل آباد آئے تھے جنہوں نے بہت خوبصورتی سے اس نانک کو سٹیج کیا۔ شام کو نانک دیکھنے کے لئے RB/209 کے سینکڑوں محنت کشوں اور کامریڈز نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں بزرگ کامریڈ جناب لطیف چوہدری، کامریڈ ارشاد، سلیم شیخ، نور احمد چوہدری اور کامریڈ لطیف دادا نے شرکت کی۔

ماہ اکتوبر میں فریڈم بھٹہ ورکز یونین کے زیر اہتمام ایک احتجاجی ریلی کا انعقاد ہوا اور DCO فیصل آباد کے آفس کے سامنے احتجاجی دھرنا دیا گیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ بھٹہ مزدوروں کی اجرت میں اضافہ کیا جائے اور حکومت وقت کی طرف سے مقرر کئے گئے معاوضے کے اعلان پر عمل درآمد کروایا جائے۔ اس احتجاجی دھرنے کی وجہ سے ضلعی انتظامیہ نے 17 اور 18 اکتوبر کو دو میٹنگیں کر کے مزدوروں کے مسائل حل کرنے کی یقین دہانی کروائی۔

14 اکتوبر کو مدینہ ٹاؤن کی یونین کونسل نمبر 144 میں بنیادی یونٹ کے حوالے سے ایک میٹنگ ہوئی اور یونین کونسل کی سطح پر تنظیم بنانے کے حوالے سے نئے شامل ہونے والے دوستوں کی ممبرشپ کی گئی۔ نئے شامل ہونے والے دوست RB/227 کراڑ والی میں دیہاتی محنت کش محاذ کے ساتھی ہیں۔

نئے شامل ہونے والے ساتھیوں نے اس بات کا عہد کیا کہ جلد از جلد دوسرے گاؤں میں بھی ممبرشپ کر کے یونین کونسل کی تنظیم کا اعلان کر دیا جائے گا۔

آؤ کہ آج غور کریں

آؤ کہ آج غور کریں اس سوال پر
دیکھے تھے ہم نے جو وہ حسین خواب کیا ہوئے
دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوشحالئ عوام کے اسباب کیا ہوئے
جو اپنے ساتھ ساتھ چلے کوئے دار تک
وہ دوست، وہ رفیق، وہ احباب کیا ہوئے
کیا مول لگ رہا ہے شہیدوں کے خون کا
مرتے تھے جن پہ ہم وہ سزا یاب کیا ہوئے
بے کس برہنگی کو کفن تک نہیں نصیب
وہ وعدہ ہائے اطلس و کمخواب کیا ہوئے
جمہوریت نواز، بشر دوست، امن خواہ
خود کو جو خود دیئے تھے وہ القاب کیا ہوئے
مذہب کا روگ آج بھی کیوں لا علاج ہے
وہ نسخہ ہائے نادر و نایاب کیا ہوئے

(ساحر لدھیانوی)

شناخت

سیدہ نزہت صدیقی،
ٹورانٹو۔کینیڈا

تمام احباب کہہ رہے ہیں
میں وہ نہیں ہوں جسے وہ صدیوں سے جانتے تھے
بجا کہ ملبوسِ تن وہی ہے
مرا دریدہ بدن وہی ہے
جسے وہ قرضوں سے پہچانتے تھے۔
مگر مرے جسم و جاں کی گہرائیوں میں محجوب 'میں'
نئی شکل لے چکی ہے
کہ جس کی پہچان جسم کے ظاہری حوالوں سے
ہو سکے گی نہ ہو سکی ہے

تمام احباب کہہ رہے ہیں
وہ مضمحل ہیں کہ ان کے معروف تجزیوں نے
جو لفظ ان کو عطا کئے تھے
کسی کی پہچان کے وسیلے، جو ان کی تاریخ نے دیئے تھے
وہ میری پہچان کا وسیلہ نہ بن سکیں گے
کہ میری میں تو وطن، زباں، رنگ و نسل و مذہب کی قید سے ماورا اک جہان نو
کی تلاش میں ہے

کہ میری میں کی شناخت اب کائنات ہے
کائنات سے کم کہیں نہیں ہے
یہ نسلِ آدم مرا گھرانہ
یہ کرہ ارض گھر ہے میرا
مرا وطن کائنات ہے

کائنات کے صد ہزار جلووں میں ایک میں بھی
بنانے والے کی جنبش موقلم کا ادنیٰ سا معجزہ ہوں
مرا حوالہ اُس ایک فنکار کا حوالہ
جو سب میں ظاہر، جو سب میں پنہاں
نبود و بود، ہست و نیست جس کے
بنانے والا، مٹانے والا
مرا حوالہ اس ایک فنکار کا حوالہ

وطن، زباں، رنگ و نسل و مذہب
ہمارے خود ساختہ خدا ہیں
ہم ان کے خالق، ہم ان کے مالک، ہم ان سے اعلیٰ
میں اپنے خود ساختہ خداؤں کو کیسے اس کا شریک کرلوں
جو سب کا خالق، جو سب کا مالک، جو سب سے اعلیٰ
مرا حوالہ اس ایک فنکار کا حوالہ

اُس ایک فنکار کے حوالے سے
نسلِ آدم مرا گھرانہ
یہ کرہ ارض گھر ہے میرا
مرا وطن کائنات ہے، کائنات سے کم کہیں نہیں ہے
کہ میری میں کی شناخت اب کائنات ہے، کائنات سے کم کہیں نہیں ہے

☆☆☆☆☆

قارئین سے اپیل

ماہنامہ ''عوامی جمہوریت'' ورکرز پارٹی پاکستان کا ترجمان رسالہ ہے جو ملک کے پسماندہ عوام اور محنت کش طبقات کی حاکمیت کے لئے مصروف جدوجہد ہے۔ ماہنامہ ''عوامی جمہوریت'' آپ دوستوں کے تعاون سے جاری ہے۔ جس میں سیاسی، سماجی، معاشی اور بین الاقوامی مسائل کے بارے میں مضامین اور محنت کشوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ماہنامہ ''عوامی جمہوریت'' نہ صرف آپ کے ساتھ رابطہ کا ذریعہ ہے بلکہ نظریاتی اور مطالعاتی لٹریچر کے ذریعے ساتھیوں کی سیاسی اور نظریاتی تربیت بھی مقصود ہے۔ لہٰذا اس اہم فریضہ کے لئے آپ سب کے مالی اور قلمی تعاون کی ضرورت ہے تاکہ رسالہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہے۔

آپ کے تعاون کا شکریہ

(ایڈیٹر)

نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (پنجاب) کا پہلا کنونشن

مورخہ 25-26 نومبر 2011 بروز جمعہ ہفتہ بوقت 10:00 بجے دن

بمقام قائد اعظم ہال ڈسٹرکٹ کورٹس (کچہری) فیصل آباد منعقد کیا جا رہا ہے

جس میں آپ کی شرکت ہمارے لئے باعث صد افتخار ہوگی

پروگرام (اوپن سیشن) مورخہ 26 نومبر 2011ء بروز ہفتہ

ریلی (دھوبی گھاٹ گراؤنڈ تا قائدِ اعظم ہال ڈسٹرکٹ کچہری فیصل آباد)۔۔۔۔10:00 بجے دن

ابتدائی کلمات (مرکزی نمائندگان، این ایس ایف پنجاب)۔۔۔۔11:00 بجے دن

حلف برداری ----------12:00 بجے دن

آمد

نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن سندھ، بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (بیچار)، جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن، سندھی شاگرد تحریک، یوتھ ویژن (لاہور) پختون خواہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن، پروگریسو یوتھ فرنٹ، جموں کشمیر پیپلز نیشنل سٹوڈنٹس آرگنائزیشن، ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن

طعام ----------1:30 بجے دن

ثقافتی پروگرام

تھیٹر (این ایس ایف پنجاب تھیٹر گروپ)، میوزیکل پرفارمنس (شہوار علی خان، اریب اظہر، عدنان (سوچ بینڈ))

رابطہ: 0346-7709088, 0331-5078723

بقیہ: مسلم شمیم

ترقی پسند تحریک اپنے ہمہ گیر اثرات کے اعتبار سے عالمی ادبیات کی اُن تحریکوں میں شامل ہے جنھوں نے افکار و اسالیب کے نئے جہانوں کی تعمیر و تشکیل اور جدید رویوں کو پروان چڑھایا ہے۔ برِصغیر پاک و ہند کی تقریباً سبھی زبانوں کے ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات اِتنے گہرے، روشن، ہمہ گیر اور دوررس و دیرپا ہیں کہ ادبی مورخ کے لیے اُن سے روگردانی ممکن ہی نہیں۔ اِس تحریک کی کم و بیش آٹھ دہائیوں کی تاریخ دراصل اُن تخلیقی کارناموں کی تاریخ ہے جو ترقی پسند مصنفین نے شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، مضمون نگاری، تخلیق و تنقید اور دیگر تمام اصنافِ ادب میں انجام دیے اور مآلِ کار ان اصناف کو مقدار اور معیار ہر دو اعتبار سے معتبر بنا دیا ہے جس کا اعتراف نہ کرنا معترضین کے لیے بھی آسان نہیں رہا۔ یہی نہیں بلکہ فکری سطح پر اِس تحریک نے فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں پر نئی جہت اور امکانات کے دریچے کھول دیے ہیں اور اِس طرح نئے طرزِ احساس اور نئی جمالیاتی اقدار کی تدوین و تہذیب ہوئی۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے زیرِ نظر کتاب 'ترقی پسند تحریک۔ سفر در سفر' میں ترقی پسند تحریک کو درپیش مسائل اور نشیب و فراز کا بڑا غائر جائزہ پیش کیا ہے۔ مذکورہ تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کے کردار اور کارناموں کے بالتفصیل تذکروں کے ذریعے تحریک کی وسعت اور ہمہ جہتی کی نہایت جامع روداد سفر صاحبِ کتاب نے بیان کی ہے۔ جن اکابرِ ادب کا فرداً فرداً تذکرہ کیا گیا ہے اُن میں منشی پریم چند، حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، جوش، رشید جہاں، ڈاکٹر عبدالعلیم، سجاد ظہیر، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری اور ڈاکٹر قمر رئیس کے اسمائے گرامی شامل ہیں جن کے حوالوں سے ترقی پسند تحریک اور نظریے کے سفر کی مکمل روداد پیش کی گئی ہے۔

پاکستان میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کو غیر قانونی قرار دیے جانے کے نتیجے میں دو ایک عشروں تک اُس کے تنظیمی جمود و سکوت کے حوالے سے جنابِ فیض کے یہ جملے بڑی معنویت کے حامل ہیں:

''تنظیمیں تو ختم ہوتی رہتی ہیں، لیکن تحریکیں ختم نہیں ہوتیں۔

ترقی پسند تحریک ہم نے تو پیدا نہیں کی تھی، وہ شروع ہی سے چلی آ رہی ہے۔ حالات کے تقاضے نے ایک تنظیم کو جنم دیا اور پھر حالات کی بنا پر تنظیم ختم بھی ہوگئی، لیکن تحریک کہاں ختم ہوتی ہے!''

☆☆☆☆☆

ورکرز پارٹی فیصل آباد اور فریڈم بھٹہ ورکرز یونین کے
زیر اہتمام بھٹہ مزدوروں کے مسائل پر احتجاجی ریلی

ورکرز پارٹی فیصل آباد کے زیر اہتمام چک نمبر 209 میں
بھگت سنگھ کی زندگی اور جدوجہد کے بارے میں ایک ناٹک اور جلسہ

CPL NO. 279

MONTHLY AWAMI JAMHURIAT
October, 2011
LAHORE

وال سٹریٹ پر قبضہ کرو
تحریک کے مناظر

ماہنامہ عوامی جمہوریت 5۔ میکلوڈ روڈ، لاہور فون 042-37357091